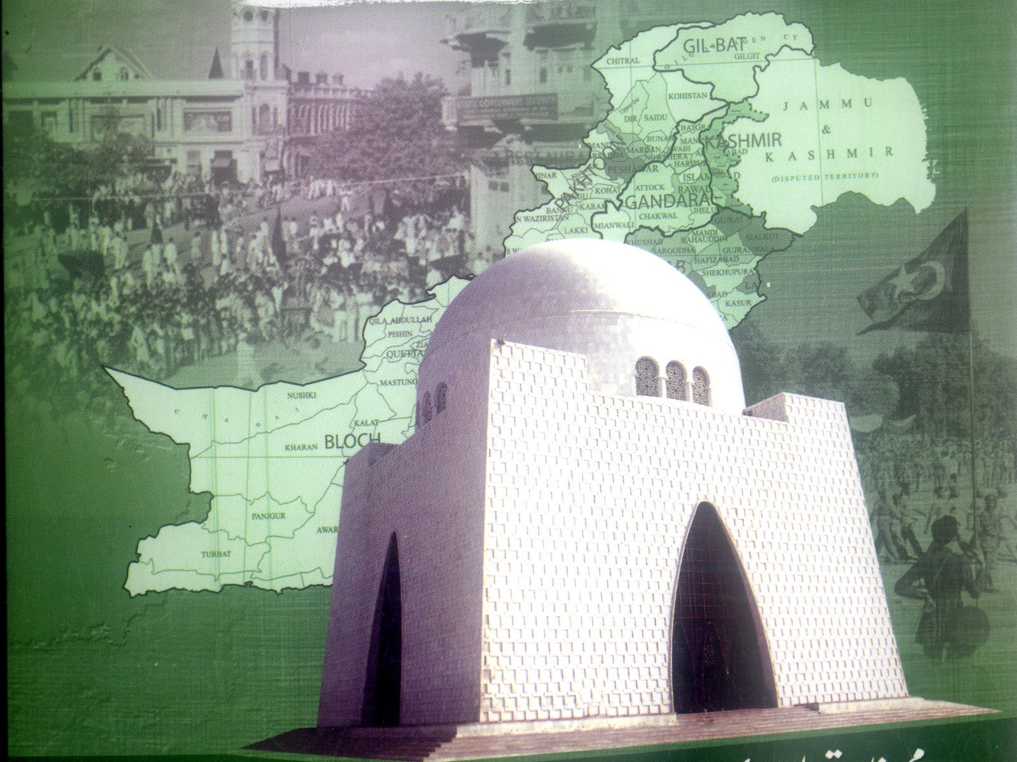
قیام پاکستان

کے محرکات اور اسباب

پاکستان کی تاریخ کا ایک روشن باب



سید محمد فاروق القادری
ایم۔اے

دارالفیض گنج بخش لاہور

قیام پاکستان
کے
محرکات اور اسباب

پاکستان کی تاریخ کا ایک روشن باب

سیّد محمد فاروق القادری
ایم۔اے

دارالفیض گنج بخش
لاہور

سلسلہ اشاعت نمبر ٦٦

نام کتاب: قیام پاکستان کے محرکات اور اسباب

تصنیف: سید محمد فاروق القادری (ایم۔اے)

سن اشاعت: ربیع الاول ۱۴۴۵ھ/ ۱۸ نومبر ۲۰۱۸ء

تعداد: ۱۲۰۰

ہدیہ: ایصال ثواب اُمت رسول ﷺ

ملنے کا پتہ:

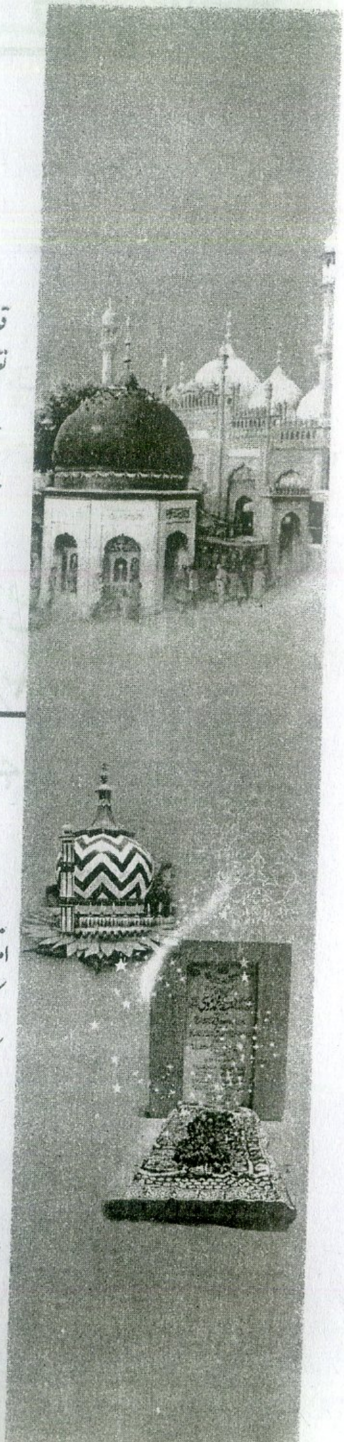
دار الفیض گنج بخش

۵۵۔حکیم محمد موسیٰ امرتسری روڈ، ریلوے روڈ (گوالمنڈی) لاہور

موبائل نمبر. 0321-4148064, 0300-4009874

حکیم محمد سلیم مرتضائی، مرتضائی دواخانہ، بالمقابل گورنمنٹ اسلامیہ کالج،

سرگودھا روڈ، فیصل آباد



بیاد

حضرت شیخ سید علی بن عثمان ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش لاہوری قدس سرہ العزیز جنہوں نے برصغیر ہند میں ۱۰۴۱ تا ۱۰۷۱ عیسوی میں اسلامی تعلیمات کو پھیلایا۔ ان کا در فیض آج بھی کھلا ہوا ہے۔ نیاز مندان داتا گنج بخش اپنے دامن میں گوہر مراد بھر کر لے جاتے ہیں اور اپنی زبان قال وحال سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

بفیضانِ نظر

لاہور کے مستور الحال درویش حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے عشق رسول کا علم تھامے رکھا، محبت رسول کی شمع کو روشن رکھا، فکر رضا کو ایک عالمی تحریک بنایا، کتاب کی خوشبو کو پھیلا کر علم و عرفان کو عوام و خواص تک پہنچایا۔ فیض موسوی آج بھی جاری ہے۔ تلاش و جستجو کے متوالے ان کے مخزن علم سے برابر مستفید ہو رہے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سلسلہ اشاعت نمبر ٦٦

نام کتاب: قیام پاکستان کے محرکات اور اسباب

تصنیف: سید محمد فاروق القادری (ایم۔اے)

سن اشاعت: ربیع الاوّل ۱۴۴۵ھ/ ۱۸ نومبر ۲۰۱۸ء

تعداد: ۱۲۰۰

ہدیہ: ایصالِ ثواب اُمت رسول ﷺ

ملنے کا پتہ:

دارالفیض گنج بخش

۵۵۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری روڈ، ریلوے روڈ (گوالمنڈی) لاہور

موبائل نمبر. 0321-4148064, 0300-4009874

حکیم محمد سلیم مرتضائی، مرتضائی دواخانہ، بالمقابل گورنمنٹ اسلامیہ کالج،

سرگودھا روڈ، فیصل آباد

بیاد

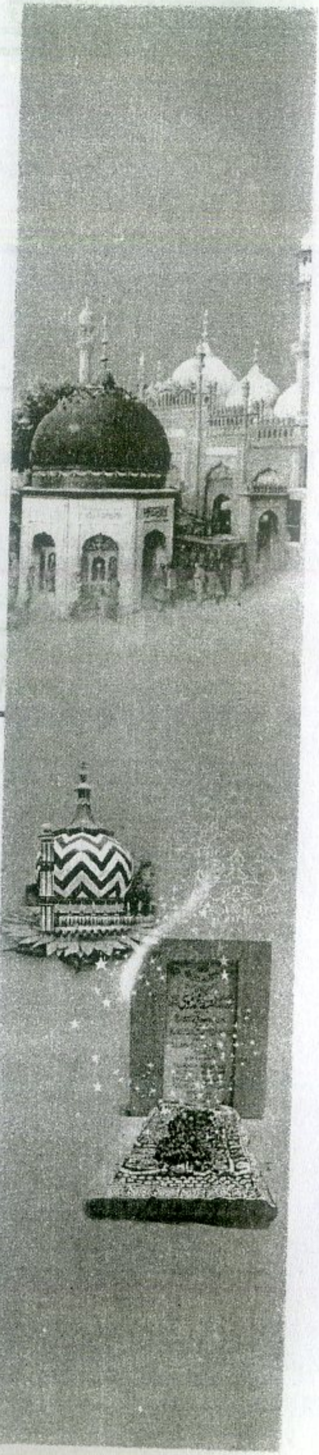
حضرت شیخ سید علی بن عثمان ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش لاہوری قدس سرہ العزیز جنہوں نے برصغیر ہند میں ۱۰۴۱ تا ۱۰۷۱ عیسوی میں اسلامی تعلیمات کو پھیلایا۔ ان کا در فیض آج بھی کھلا ہوا ہے۔ نیاز مندان داتا گنج بخش اپنے دامن میں گوہر مراد بھر کر لے جاتے ہیں اور اپنی زبان قال وحال سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

بفیضانِ نظر

لاہور کے مستور الحال درویش حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے عشق رسول کا علم تھامے رکھا، محبت رسول کی شمع کو روشن رکھا، فکر رضا کو ایک عالمی تحریک بنایا، کتاب کی خوشبو کو پھیلا کر علم و عرفان کو عوام و خواص تک پہنچایا۔ فیض موسوی آج بھی جاری ہے۔ تلاش و جستجو کے متوالے ان کے مخزن علم سے برابر مستفید ہو رہے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما



اعزاز

یہ کتاب حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمۃ کے انیسویں سالانہ عرس مبارک

ربیع الاوّل ۱۴۴۰ھ/ ۱۸ نومبر ۲۰۱۸ء

کے موقع پر تقسیم کی جارہی ہے۔

☆☆☆☆☆

انتساب

میں یہ اَوراق پاکستان کے سچے محبؔ، اسلام کے شیدائی، علم و فضل کے مالک، اور مستور الحال درویش، حکیم الملت حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمۃ کے نام منسوب کرتا ہوں جو ہر اعتبار سے اس کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از مَن
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

سید محمد فاروق القادری

آستانہ عالیہ شاہ آباد شریف، گڑھی اختیار خاں

۲۳ جون ۲۰۱۸ء

☆☆☆☆☆

چند ضروری گزارشات

تازہ خواہی داشتن گرداغ ہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

یہ مختصر رسالہ دراصل میرا وہ مضمون ہے جو تقریباً چالیس برس قبل میں نے حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر میاں محمد صادق قصوری کی کتاب ''اکابر تحریک پاکستان'' کے پیش لفظ کے طور پر تحریر کیا تھا' یہ مختصر مضمون اپنی جامعیت اور حقیقت حال کی وجہ سے پاکستان کے محبّ حلقوں میں کافی پسند کیا گیا' بعض اداروں نے اس پیش لفظ کو کتاب سے علیٰحدہ رسالوں کی صورت میں بھی شائع کیا۔

اب میرے مخلص دوست میاں زبیر احمد صاحب قادری ضیائی نے حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عرس پر اسے پھر شائع کرنے کا ارادہ فرمایا ہے اور مجھے حرفِ تازہ کے طور پر چند حروف لکھنے کی فرمائش کی ہے' میاں زبیر احمد صاحب قادری مدظلہ اور میں نے برسوں اکٹھے حکیم صاحب کے میکدۂ علم و عرفان سے مقدور بھر اپنی جھولیاں بھری ہیں' لاہور کے چار سالہ قیام اور پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران ہمارا شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جس میں میاں زبیر احمد صاحب قادری' میاں محمد سلیم حماد سجادہ نشین دربار داتا صاحب' صاحبِ علم و فضیلت علامہ اقبال احمد فاروقی' مرحوم قاضی عبدالنبی صاحب کوکب اور اس وقت کے بے شمار نوجوانوں نے حکیم صاحب علیہ الرحمہ کے دارالعرفان سے خوشہ چینی نہ کی ہو' حکیم صاحب ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے' ایسے لوگ عطیے کے طور پر بھیجے اور محرومی کے طور پر اُٹھا لیے جاتے ہیں' اس قحط الرجال اور

در ر نا ہنجار میں ایسے لوگ کہاں۔

اب کہاں ہیں وہ ہستیاں آباد
دل کی تھیں جن سے بستیاں آباد

یہ تحریر جتنی چالیس سال پہلے اہم تھی' آج اس کی اہمیت اور ضرورت اس وقت سے کہیں بڑھ کر ہے' پاکستان کیوں بنایا گیا ہے؟ اس کے محرکات اور اسباب کیا تھے؟ پاکستان بنانے والے لوگ کون تھے اور اس کی مخالفت کن لوگوں کے حصے میں آئی؟ یہ ہماری تاریخ کا ایسا حصہ ہے جسے ہمیشہ نئی نسل کو آگاہ رکھنا بے حد ضروری ہے' اس کا مقصد معاذ اللہ نہ کسی جماعت یا فرد کی تنقیص و توہین مراد ہے اور نہ کسی جماعت یا افراد پر تیز روشنی ڈالنا مقصد ہے۔

ہمارے رہنما ڈاکٹر سر محمد اقبال' قائداعظم محمد علی جناح' لیاقت علی خان' نواب بہادر یار جنگ' مولانا حسرت موہانی' ظفر علی خان' سردار عبدالرب نشتر اس نئی مملکت کو کن بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے' کیا اسلام کا فلاحی نظام اور مدینہ منورہ کی مثالی ریاست کا ماڈل ایک ایسا خطہ زمین حاصل کیے بغیر ممکن تھا؟ جس میں اکثریت مسلمانوں کی نہ ہو' اس موضوع پر کتاب کے اوراق ان شاء اللہ ایک ایسا متن ثابت ہوں گے جس کی تشریح و توضیح ہمیشہ کی جانی چاہیے۔

اس نوزائیدہ مملکت میں قائد محمد علی جناح' ڈاکٹر محمد اقبال' لیاقت علی خان' سردار عبدالرب نشتر' مولانا حسرت موہانی ایسے تمام اکابرین قیامِ پاکستان کے بعد جلدی اللہ کو پیارے ہو گئے تو اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس مملکت کے حکمرانوں نے لوٹ کھسوٹ بندر بانٹ کی وہ داستان رقم کی جس سے بانیانِ پاکستان کی روحیں قبروں میں تڑپ اُٹھیں' اشرافیہ کا ایک خاص طبقہ ملک پر قابض ہوا تو کرسیوں کے کھیل تماشے کی ایسی ناٹک شروع ہوئی جس کے بارے میں علامہ اقبال کے شعر بہتر نمائندگی کرتے ہیں:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

میرا تعلق اس خانوادے سے ہے جس نے قائداعظم علیہ الرحمۃ کے ساتھ پاکستان کی خاطر کانگریس، انگریز، احرار خاکسار، جمعیۃ الانصار، نیشلسٹ علماء سرخ پوش اور کئی دوسرے لوگوں کے ساتھ چومکھی لڑائی لڑی۔

میں دردِ دل اور خون کے آنسو بہاتے ہوئے بے اختیار چند باتیں عرض کرتا ہوں:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

میں انتہائی دردِ دل کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بحمد للہ! پاکستان کی بہادر، منظّم اور مضبوط افواج ایک ایسا ادارہ ہے جس نے جان پر کھیل کر اس ملک کی نظریاتی اور سرحدی اساس کی حفاظت کی ہے، پاکستان اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور آنحضور ﷺ کی نظرِ رحمت کا نتیجہ ہے، کیا کسی حکومت نے اس ملک کو مدینہ کی مثالی ریاست کا رول ماڈل بنانے کی زحمت کی ہے! یہاں ظہر الفساد فی البر والبحر کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔

اسلامی حکومت کا نام آتے ہی بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ شاید ایسی حکومت سختی سے داڑھیاں بڑھانے، نمازیں پڑھوانے اور روزے رکھوانے پر عمل پیرا ہوگی۔ بندہ پرور، اسلامی حکومت سے مراد ایسی فلاحی ریاست کا قیام ہے جو معاشی استحصال، معاشی ناہمواری، لامحدود ملکیت کی نفی اور غریب و امیر کے فرق کو بتدریج عمل کرانے کی ذمہ داری قبول کرے، علامہ اقبال نے اس کی بہترین تشریح یوں فرمائی۔

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبیں این است و بس

جن لوگوں کو اسلامی نظام سے الرجی ہونے لگتی ہے وہ تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کرتے ہیں، انہیں پتہ ہے کہ اس سے فلاح مملکت ہے مگر وہ خود غریبوں کو وسائل رزق میں برابری کی حیثیت دینے، ان کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہونے، ان کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ کر کھانے کے لیے

تیار نہیں، کچھ لوگ بھوک سے مر رہے ہیں، اپنے اعضاء بیچ رہے ہیں، انصاف سر عام بک رہا ہے، کروڑوں کے اخراجات وصول کرنے والے ہسپتال، ڈسپرین اور سرنج تک مریض کو میڈیکل سٹور سے لینے پر مجبور کرتے ہیں، پولیس اور چھوٹے اہلکاروں نے عوام کا جینا دوبھر کر دیا ہے، معمولی درجے کے افسر اپنی کرسیوں پر فرعون بنے بیٹھے ہیں، سرکاری زمین اور جنگلات حکومت کا وفادار طبقہ شیر مادر سمجھ کر ہڑپ کر رہا ہے، یہ کیفیت کسی ایک حکومت سے خاص نہیں بلکہ ہر نئی حکومت نے اس کے تناسب میں اضافہ کیا ہے:

ع حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ہمیں یقین ہے کہ موجودہ فرسودہ باسی اور ناکارہ نظام ٹاکیاں لگا کر گانٹھنے سے درست نہیں ہوسکتا، یہ گل سڑ کر ناکارہ ہو چکا ہے، اس کی صورت یہ ہوگئی ہے:

ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کُجا کُجا نہم

بقول شاہ ولی اللہ ''فَكُّ كل نظامٍ'' ہر نظام کو یکسر ختم کر دینا چاہیے اس کی جگہ نیا طاقت ور، مستعد اور ملک کی اکثریت کے مسائل حل کرنے والا نظام لایا جائے اگر ایسا نہ کیا گیا تو نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔

بدلنا ہے تو مئے بدلو نظامِ مے کشی بدلو وگرنہ جام و مینا کے بدل جانے سے کیا ہوگا

ایک طرف ملک کے اسّی فیصد عوام جانکنی کی کیفیت میں ہیں، دوسری طرف ہمارا جدید تعلیم یافتہ اور ملک کے اقتدار پر قابض طبقہ (جو ہر دور میں شکلیں بدل کر کرسیوں پر براجمان ہے، کرسی کے کھیل تماشے میں مصروف ہے، اس طبقے کا یہ جرم کسی طرح قابلِ معافی نہیں کہ سات دہائیوں سے ملک کے سیاہ وسفید کا مالک ہونے کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ملک کو اس کی اصلی اہداف سے کوسوں دور کر دیا ہے بلکہ اس نے رشوت، ظلم، ناانصافی، آمریت، طبقاتی کشمکش کا کارِ

بے خیر بڑی ہمت اور جرأت سے انجام دیا ہے۔

صدرِ اوّل کے مسلمان جن قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے ان میں صرف وہ لوگ ہی نہیں جو خدا اور رسول کے منکر تھے بلکہ وہ لوگ تھے جنہیں قرآنِ مجید مترفین، مسرفین، ظالمین اور جانے کن کن تہدیدآمیز خطابات سے نوازتا ہے، یہ مترفین آج کی اصطلاح میں سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں۔ جو لوگ معرکۂ کرب و بلا کو محض دو قبیلوں یا مخصوص انداز کی نیکی بدی کی جنگ قرار دیتے ہیں انہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اس جنگ میں ایک طرف نبوی فقر و درویشی کے نمونے تھے اور دوسری طرف قیصری جاہ و جلال اور قبائلی عصبیتوں کے نمائندے اور اس طرح سے یہ کہنا کچھ نامناسب نہیں کہ دوسرے اسباب کے علاوہ اس موقع پر یزید کے خلاف خاندانِ نبوت کی جدوجہد کا ایک بڑا سبب اس جاگیردارانہ، مستبدانہ، مترفانہ، ظالمانہ اور آمرانہ ذہنیت کا مقابلہ کرنا تھا جو اسلام کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن رہی تھی، اسی طرح امام حسین علیہ السلام کے خلاف یزید کے اقدامات کا مقصد دراصل اس غریب پرست مزاج کا خاتمہ تھا، امام حسین علیہ السلام جس کے امین اور وارث تھے اور جس کی تلقین رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی۔

پس چہ باید کرد!

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو! کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

میں نے برسوں ایک قدیم و جدید مدارس و مکاتب میں تعلیم حاصل کی ہے اور عموماً امتیازی حیثیت سے اپنی تعلیم مکمل کی ہے، پھر زندگی کا ایک بڑا حصہ میں نے تحقیق مطالعۂ مشاہدہ اور لکھنے پڑھنے میں گزارا ہے، میرے علمی کام کو پاکستان و ہند کے علمی حلقوں نے تحسین کی نگاہ سے دیکھا ہے، میں نے مسلمانانِ عالم بالخصوص اہلِ پاکستان کے انحطاط، تنزل، پستی، پسماندگی اور معاشی

معاشرتی، اخلاقی اور علمی اعتبار سے اس کے اُلٹے پاؤں پھرنے کی وجوہات اور اسباب کو سمجھنے کے لیے بہت غور وفکر کیا ہے، مجھے اس بات نے بہت ہی بے چین اور مضطرب کیا ہے کہ:

ع کیوں نہیں ہوتی سحر حضرت انساں کی رات!

سارے مسئلے کو سوچنے سمجھنے کو ٹنے چھاننے اور کھنگالنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو بات مسلمانانِ عالم بالخصوص اہلِ پاکستان کو مسلسل پیچھے دھکیل رہی ہے وہ ان پر مسلط ظالمانہ معاشی نظام، انتہائی سنگدل اقتصادی طرزِ حیات، آمرانہ اندازِ حکمرانی، اسلام کی غلط تعبیر وتوضیح، بیشتر مذہبی قائدین کے قول وفعل میں فرق، عزیمت کی بجائے مسلسل ان کا رخصت پر عمل پیرا ہونا اور تبلیغ وارشاد اور اصلاح کی بجائے سیاست کی دلدل میں اُترنا ہے، اس ناکارہ نظام کے بارے میں حضرت علامہ نے فرمایا ہے:

دانش وتہذیب ودیں سودائے خام
تاتہ و بالا نہ گردد ایں نظام

یہ کیسے ہوگا اور کون کرے گا! کیا یہی اشرافیہ کرے گی جس نے ملک کو بے حال کر رکھا ہے!

نہیں نہیں!

زمانہ کچھ نہیں کرتا کبھی کسی کے لیے
بقا کی فکر کرو زندگی کے لیے
کیفی اعظمی

اس وقت تو یہ حالت ہے کہ بقول فراقؔ:

بیمار کی رات ہو گئی ہے
اِس دور میں زندگی بشر کی

اگر من حیث القوم ہم نے کچھ نہ کیا تو پھر اور تو پھر کا جواب ہر شخص کو معلوم ہے۔

سید محمد فاروق القادری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

جب سے برصغیر پر فرنگی اقتدار نے پیر جمائے ٹھیک اسی وقت سے آزادیٔ وطن کے مشن کا بھی آغاز ہوا۔ یہ آغاز کن لوگوں نے کیا؟ اس پر کماحقّہ روشنی ڈالنے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ انگریزی سامراج کی نوآبادیاتی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ ادھر اس نے ایک خطے پر قبضہ جمانے کو قدم رکھا اور اِدھر اس قطعۂ ارض کا حساس سینہ کرب سے چیخ اُٹھا۔ یہی وہ پہلی چیخ تھی جسے بلاشبہ جنگِ آزادی کا پہلا غلغلہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ آواز کس طبقے نے بلند کی؟ اس کا جواب پوری تاریخ میں ایک ہی ہے' علماء اور مشائخ!

آج ہماری آزادی کی تاریخ جس انداز سے مرتب ہو کر سامنے آ رہی ہے اس میں قلم کا تعصب پورے طور پر سرایت کئے ہوئے ہے۔ تحریکِ آزادی محض ایک وقتی اور ہنگامی جذبہ نہ تھا بلکہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ایک منظّم پروگرام کی بنیاد تھی جس نے آگے چل کر پاکستان کا روپ دھارا' اس پوری تحریک کا مطالعہ کرنے سے ہمارے سامنے دو قسم کے لوگ آتے ہیں' ایک تو وہ جن کا مقصد صرف انگریزی سامراج سے نجات حاصل کرنا تھا' اس کے بعد سیکولر اسٹیٹ بنے یا عملاً ہندو سامراج اس کی جگہ لے لے' انہیں اس سے کچھ غرض نہ تھی' دوسرے وہ جو عملی طور پر دوبارہ برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار بحال کر کے یا ایک علیٰحدہ خطّۂ زمین حاصل کر کے قرآنی نظامِ حیات پر مشتمل ایک اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ دوسرے مقصد کے مقابلے میں پہلا مقصد ذرا بھی مقدس نہیں۔ آج ہم جب پورے حالات پر

غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ افسوسناک تاریخی مغالطہ ایک حقیقت کا روپ دھارتا جا رہا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اصل عظمت و کردار کا مستحق پہلا گروہ ہے اور اگر ملّی تاریخ میں کچھ خدمات ہیں تو بس اسی کی!

تحریکِ پاکستان کی بنیاد ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا کافی مراد آبادی شہید، سید احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا رضی الدین بدایونی ایسے مجاہدینِ آزادی اور سرفروشانِ اسلام اپنا خونِ جگر دے کر پھانسی کے تختوں پر چڑھ کر اور کالے پانی کی تکالیف برداشت کر کے، رکھ چکے تھے۔ مجاہدین کا یہ گروہ اسی سوادِ اعظم سے تعلق رکھتا ہے جسے آج بھی قال اقولی قسم کے مُلّا حضرات جذبۂ حبِ نبوی میں غلو کا الزام دیتے ہیں۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ برصغیر میں انگریزی سامراج کی بنیادیں ہلانے والوں اور اسلامی حکومت کے اوّلین معماروں کو تو پسِ پشت ڈال دیا گیا اور ان کے مقابلے میں بوجوہ سیّد احمد بریلوی اور شاہ محمد اسمٰعیل کو پورے برصغیر کی مذہبی و ملّی تحریکات کا واحد ہیرو بنانے کی کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔ ایک گروہ پر تاریخ کی یہ تیز روشنی اور دوسرے کو اندھیروں میں رکھنے کے پیچھے دو علیٰحدہ نظریات کا وہی جذبہ کارفرما ہے جس کے بارے میں ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ اسے حسنِ اتفاق سمجھئے یا سوءِ اتفاق کہ ایک نظریئے کی تصویب و تائید کے لیے اسے علمی فضا میسر ہوگئی جو دوسرے کو نہ ہوسکی۔ شاہ محمد اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی کی تحریک پر تبصرہ ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، البتہ اس تحریک کے بارے میں مولوناحسین احمد مدنی کا یہ غور طلب تجزیہ پیشِ خدمت ہے، آپ لکھتے ہیں:

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلّط اور اقتدار کا قلع قمع

کرنا تھا جس کے باعث ہندو مسلمان دونوں پریشان تھے‘ اس بناء پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور صاف صاف انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کرنا ہے‘ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی؟ اس سے آپ کو غرض نہیں‘ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے‘ ہندو یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے“۔ (نقشِ حیات‘ جلد۲ صفحہ۱۳)

اس کے ساتھ ہی مولانا عبید اللہ سندھی کی یہ عینی شہادت بھی ملاحظہ فرمایئے:

”ایک دفعہ میں سرحد پار بنیر کے مقام پر گیا...... میں اس اُمید میں کہ شاید سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی جماعت مجاہدین میں زندگی کی کوئی کرن دکھائی دے ادھر چل دیا‘ وہاں پہنچ کر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حد درجہ افسوس ناک تھا اور قابلِ رحم تھا وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ جماعت جو مجاہدین کے نامِ نامی سے یاد کی جاتی ہے‘ کس بری حالت میں ہے اور اس کی گزران اور اس کی زندگی کس طرح صاحبزادہ عبد القیوم خاں کی وساطت سے انگریزی حکومت کی رہینِ منّت ہے“۔

(افادات وملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی‘ از محمد سرور‘ صفحہ ۳۶۲)

دیکھا آپ نے؟ وہ تھا نظریہ‘ یہ ہے عمل۔ پورا برصغیر فرنگی اقتدار کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ ہلال وصلیب کے حرب صرف ملک گیری ہی تک محدود نہیں بلکہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی گستاخیوں سے بڑھ کر مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں‘ سوادِ اعظم کے علماء وفقراء پر قیامت گزر گئی ہے‘ قال اللہ اور قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نغمات الاپنے والے پھانسی کے پھندوں‘ جیل کی کوٹھڑیوں اور کالے پانی کو آباد کئے ہوئے ہیں مگر مجاہد فی سبیل اللہ اور شہیدِ اسلام اس سارے معرکے کو غیر اہم سمجھتے ہوئے فرنگی اقتدار کے قابو میں نہ آنے والے آزاد قبائل

کے ساتھ رفع یدین اور نکاحِ بیوگان کے مسئلے پر جہاد کر رہے ہیں' یا پھر ایک غیر سیاسی قوت سکھوں کے ساتھ لڑائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ؎

خِرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خِرد

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

قیامِ پاکستان کے اسباب

دو مختلف نقطہ ہائے نظر کا یہی وہ اختلاف ہے جو آگے چل کر تحریکِ پاکستان اور پھر قیامِ پاکستان تک بڑھ کر نقطۂ عروج کو پہنچا۔ قیامِ پاکستان کے اسباب کے سلسلے میں پہلے مختصر طور پر ہندو ذہنیت کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

بلاشبہ آزادی کی تحریک اکٹھے شروع ہوئی مگر جلدی ہندو طرزِ عمل نے ثابت کر دیا کہ یہ محض اقتدار کی تبدیلی ہوگی اور ہندو اقتدار کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ثابت ہوگا' اس لیے دردمند مسلمانوں نے جلد ہی اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ مسلمان اپنے مذہب کی بناء پر ایک الگ قوم ہیں اور وہ اپنے دین کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قانونِ الٰہی نافذ کر سکیں۔ یہ خیال کیوں پیدا ہوا؟ اس کے محرکات جاننے کے لیے ذیل کے حوالہ جات ملاحظہ کیجئے:

ڈاکٹر رادھا مکر جی نائب صدر ہندو مہا سبھا و صدر کانگریس بنگال نے کہا:

''ہندوستان کو نظریہ اور عمل کے لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیے جس کا کلچر ہندو جس کا مذہب ہندو ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو''۔

(طلوعِ اسلام' دسمبر ۱۹۳۸ء)

کانگریس کے جنرل سکریٹری اچاریہ کرپلانی نے اگست ۱۹۳۹ء میں اپنے ایک بیان میں کہا:

''گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں بلکہ یہ سب سے ضروری چیز ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفہ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت' اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو' بالفاظِ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیے'' الخ۔ (طلوعِ اسلام' مارچ ۱۹۶۹ء)

مہاتما گاندھی نے ۱۵/ دسمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا:

''میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباء واجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو' وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنے آباء واجداد سے الگ ایک قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم رہنا چاہیے خواہ اس کے سپوتوں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو''۔ (طلوعِ اسلام' مارچ ۱۹۶۹ء)

گئو رکھشا کے بارے میں انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا:

''یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یورپین کے لیے گاؤ کشی جاری رکھنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریز عملداری نے پیدا کر دیا ہے مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے طول وعرض میں ایسا نہیں جو اپنی سرزمین کو گاؤ کشی سے آزاد کرانے کی اُمید نہ رکھتا ہو' ہندو مت عیسائی یا مسلمان کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے سے تامل نہیں کرے گا کہ وہ گاؤ کشی بند کر دیں''۔ (طلوعِ اسلام' مارچ ۱۹۶۹ء)

دوسرے مقام پر گاندھی جی یوں گویا ہوتے ہیں:

''میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں، اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ کے عقیدہ پر یقین رکھتا ہوں، میں گئو رکھشا کو اپنے مذہب کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا، میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے''۔

(ینگ انڈیا ۳۱/۱۰/۱۲، بحوالہ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۶۹ء)

اب مذہب کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی سُنیے:

''جس چیز کو مذہب یا منظّم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اُٹھانے کا قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقاء کا حمایتی ہے''۔ (طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء)

ہندو دھرم کی یہی وہ قدیم منافقانہ پالیسی تھی کہ اپنے دھرم پر آنچ نہ آئے، دوسروں کی بات آئے تو سیکولر حکومت کی باتیں کرنے لگو۔ جس سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے فرمایا: ؎

نمی گوید بہ کس اسرارِ خود را | نگہ دارد برہمن کارِ خود را
بدوشِ خود برد زنّارِ خود را | بہ من گوید کہ از تسبیح بگذر

یہ وہ حالات تھے جنہیں دیکھ کر حساس مسلمانوں کے دل کانپ اُٹھے اور انہوں نے بروقت متنبہ کیا کہ ہندو اپنی عیاری اور دورُخی پالیسی کے لحاظ سے انگریز سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ سوادِ اعظم کے عظیم روحانی پیشوا مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے بروقت خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

''تم نے دیکھا یہ حالت ہے ان لیڈر بننے والوں کے دین کی، کیا کیا شریعت کو مَسلتے، بدلتے، پاؤں کے نیچے کچلتے اور خیر خواہِ اسلام بن کر مسلمانوں کو چھلتے ہیں، موالاۃِ مشرکین ایک، معاہدۂ مشرکین دو، استعانت بمشرکین تین، مسجد میں اعلائے مشرکین چار، ان سب میں بلا مبالغہ یقیناً قطعاً لیڈروں نے خنزیر کو دُنبے کی کھال پہنا کر حلال کیا ہے''۔ (المحجۃ المؤتمنۃ، صفحہ ۸۶۔۸۷)

ہندو ذہنیت کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہی فاضل بریلوی نے ترکِ موالات کا وہ مشہور فتویٰ لکھا جسے سہارا بنا کر یار لوگوں نے آپ کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی حالانکہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جس وقت فاضل بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو آپ نے صاف فرمایا:

''مولانا! میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں، میں مخالف ہوں''۔ پھر فرمایا: ''مولانا! میں ملکی آزادی کا مخالف نہیں، ہندو مسلم اتحاد کا مخالف ہوں''۔ (فاضل بریلوی اور ترکِ موالات، پروفیسر محمد مسعود احمد، صفحہ ۴۵)

کانگریسی علماء کی ذہنیت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ جس نے انہیں ہندوؤں کے چرنوں میں سجدہ ریزی سے روکا، انہوں نے اپنے بیگانے کی تمیز کیے بغیر فوراً اس پر انگریز دوستی اور وطن دشمنی کا فتویٰ جڑ دیا۔ فاضل بریلوی اور تمام مسلم لیگی زعماء تو مجرم تھے ہی، اتفاق سے پورے دیوبند میں صرف ایک عالم مولانا اشرف علی تھانوی نے ان سے اختلاف کیا تو ان کو جو صلواتیں سننا پڑیں ان کی جھلک آپ بھی دیکھ لیجیے۔

پروفیسر محمد سرور کا بیان ہے:

''مولانا سندھی، مولانا اشرفعلی صاحب تھانوی کے علم و فضل اور ارشاد و سلوک میں

انہیں جو بلند مقام حاصل تھا اس کے تو قائل تھے لیکن تحریکِ آزادی ہند کے بارے میں ان کی جو معاندانہ اور انگریزی حکومت کے حق میں مؤیدانہ روش رہی، اس سے وہ بہت خفا تھے"۔ (افادات وملفوظات مولانا عبیداللہ سندھی، صفحہ ۳۸۲)

پاکستان اور نیشنلسٹ علماء

دوقومی نظریے کی کہانی بہت پرانی ہے۔ برصغیر کے اکثر مسلمان مفکرین مسلمانوں کے علیحدہ ملّی تشخص اور سرزمینِ حجاز سے اس کی وابستگی پر ہمیشہ زور دیتے رہے ہیں۔ مجددِ الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (تذکرہ شاہ ولی اللہ، مناظر حسن گیلانی) اور فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں (رحمہم اللہ تعالیٰ) (فاضل بریلوی اور ترکِ موالات، پروفیسر محمد مسعود احمد) نے پورے شدومدّ سے اس کی وضاحت کی ہے۔ ہم یہاں پر مکتبِ دیوبند کے علماء سے یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر وہ بقولِ خود شاہ ولی اللہ کی تحریک کے وارث اور جانشین ہیں تو پھر ان کے دینی وملّی نظریات پر کامل طور پر یقین نہ رکھنے کا سبب کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی نگاہ میں دین صرف سجود و قیام کا نام ہے اور کسی اسلامی ریاست کے لیے بنیادی نظریات فراہم کرنے کے سلسلے میں وہ دینِ اسلام کے مفکرین سے مدد لینے کے بجائے اپنے خودساختہ اور دوراز کار ضوابط پر عمل پیرا ہیں؟ دوقومی نظریہ جس کی بنیاد کتاب وسنت اور مسلمانوں کا چودہ سوسالہ تہذیبی ورثہ ہے اس کے مقابلے میں وطنی قومیت کا نعرہ ایک ایسا کھلا غیر اسلامی دعویٰ ہے جو گاندھی اور نہرو ایسے پُر پیچ، مفاد پرست اور عیّار سیاستدانوں سے تو متوقع ہوسکتا ہے مگر صاحبانِ جُبّہ ودستار اور وارثانِ منبرومحراب کو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔

افسوس نیشنلسٹ علماء کی اکثریت نے برصغیر میں اسلامی ریاست کی امکانی حد تک مخالفت کر کے تحریکِ آزادی کے سلسلے میں بھی اپنے تھوڑے بہت کام پر لکیر پھیر کر رکھ دی ہے۔ کیا وقت کا بیدار مؤرخ یہ لکھنے میں حق بجانب نہ ہوگا کہ علمائے دیوبند کا یہ گروہ مجدد الف ثانی اور شاہ

ولی اللہ کے مقابلے میں گاندھی جی کی میکیاوَلی سیاست پر زیادہ یقین رکھتا تھا اور اس نے مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کے دور میں سات کروڑ مسلم عوام کے مقابلے میں اپنا سارا وزن ہندوؤں کے پلڑے میں رکھ دیا؟

یہ تلخ حقیقت علمائے دیوبند کو برداشت کرنا پڑے گی کہ ان کے پیشِ نظر برصغیر میں اسلامی حکومت کا قیام کبھی بھی نہیں رہا بلکہ وہ ہمیشہ جمہوری انداز کی سیکولر حکومت کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ شاہ محمد اسمٰعیل کی تحریک ہو کہ جمعیۃ العلمائے ہند کی تنظیم' احرار ہوں یا آزاد' ان سب کا اندازِ فکر اس معاملے میں حیرت انگیز یکسانیت کا حامل رہا ہے۔ اسلامی حکومت کا قیام تو بہت مقدس نصب العین ہے انہوں تو مسلمانوں کے مفادات تک کی پرواہ نہیں کی جو احسان کا معمولی درجہ ہے۔

یہ ایک واقع ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی ہو یا قیامِ پاکستان کی جدوجہد یہ انہیں لوگوں کی رہینِ منّت اور شرمندۂ احسان ہیں جنہیں آج بھی مکتبِ دیوبند کے ذمہ دار فرد سے طفلِ مکتب تک بدعتی' قبر پجوے اور میلاد خواں کے طعنے دیتے ہیں۔ کیا پاکستان کی کوئی تاریخ ''بنارس سُنّی کانفرنس'' کے فقید المثال اجتماع کا ذکر کئے بغیر مکمل ہو سکتی ہے؟ صدر الافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی' ابوالحامد سید محمد شاہ محدث کچھوچھری' خواجہ محمد قمر الدین سیالوی' مولانا امجد علی' پیر جماعت علی شاہ علی پوری' مولانا عبدالحامد بدایونی' پیر سید مغفور القادری' مولانا ابوالحسنات قادری' علامہ عبدالغفور ہزاروی' پیر صاحب مانکی شریف' پیر صاحب گولڑہ شریف' مولانا عبدالستار خاں نیازی' یہ عظیم شخصیتیں اور لاکھوں انسانوں کے مقتدا کون ہیں؟ وہی تو ہیں جو فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں کے ہم مسلک تھے' آج ان پر کیچڑ اچھالنے والے ذرا جائزہ تو لیں کہ پورے مکتبِ دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی یا مولانا اشرفعلی تھانوی کے محدود حلقے کے دو چار آدمیوں کے سوا باقی سارے علماء عملی طور پر کہاں کھڑے تھے؟ برصغیر کے تمام علمی مدارس

اور مکاتب پر مولانا مدنی اور دیوبند کے اسی حلقے کے اثرات تھے جو نیشنلسٹ خیالات کا علمبردار اور گاندھی و نہرو کو قبلۂ سیاست سمجھے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کے حلقے میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی پذیرائی کی یہ شان صرف اس لیے بنی کہ وہ اپنے سارے قافلے سے تنہا کٹ کر ادھر آئے تھے' دیوبند کے علماء و طلباء نے انہیں اس کی جو سزا دی وہ خود انہیں کی زبانی سنیئے:

''دارالعلوم دیوبند کے طلباء نے جو گندگی گالیاں اور فحش اشتہارات اور کارٹون ہمارے متعلق چسپاں کیے جن میں ہم کو ابوجہل تک کہا گیا اور ہمارا جنازہ نکالا گیا۔

آپ حضرات نے اس کا بھی کوئی تدارک کیا تھا؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے تمام مدرسین' مہتمم اور مفتی سمیت بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے نسبتِ تلمذ رکھتے ہیں''۔ (مکالمۃ الصدرین' طبع ہاشمی بک ڈپو لاہور' صفحہ ۳۲-۳۳)

مکتب دیوبند کے نامور عالم شیخ الہند مولانا محمود حسن کو کون نہیں جانتا آج اسیر مالٹا اور تحریکِ آزادی کے مجاہدین میں انہیں سرِ فہرست شمار کیا جاتا ہے' برصغیر سے انگریزی اقتدار کے خاتمے کا جو پروگرام آپ نے مرتب فرمایا اس میں کسی اسلامی حکومت کے تصور کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے واضح طور پر ایک لادینی (سیکولر) حکومت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کو آپ ہی نے کابل بھیجا' وہاں آپ کے حکم اور مشورے سے.......... موقتہ ہند کے نام سے ایک متوازی حکومت بنائی گئی لیکن آپ حیران ہوں گے کہ اس حکومت کے لائف پریذیڈنٹ (Life President) معروف متعصب سکھ لیڈر راجہ مہندر پرتاب (آپ بیتی ظفر حسن ایبک' طبع منصور بک ہاؤس لاہور' صفحہ ۱۰۰) مقرر ہوئے جبکہ مولانا عبیداللہ سندھی اس کے وزیر خارجہ تھے۔ اس سے آپ بخوبی اس حکومت کا نقشہ سمجھ سکتے ہیں جو ان حضرات کے ذہنوں میں موجود تھا۔ مزید اطمینان کے لیے مولانا سندھی اور راجہ صاحب کے رفیقِ کار ظفر حسن صاحب کا یہ تبصرہ

ملاحظہ فرمائیے اور ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ یہ حضرات مسلمانوں کو کہاں لے جارہے تھے؟

ظفر حسن ایبک لکھتے ہیں:

''راجہ مہندر پرتاب ہندوستان کے آزاد ہونے پر وہاں ایک ہندو حکومت قائم کرنا چاہتے تھے''۔ (آپ بیتی ظفر حسن ایبک، طبع منصور بک ہاؤس لاہور، صفحہ ۹۷)

خدا لگتی کہئے کیا یہ تجزیہ اس سے کچھ مختلف ہے جو مسلم لیگی زعماء نے کانگریس کے بارے میں کیا تھا؟

مولانا عبیداللہ سندھی نے کابل سے آزادئ ہند کے بعد حکومت کا جو نقشہ پیش کیا اس کی یہ شق دیدنی ہے (یہ بات پیشِ نظر رہے کہ مولانا سندھی شیخ الہند کے معتمد خصوصی، ان کے فرستادہ اور انہی کے مشن کی تکمیل کے لیے کابل گئے تھے) مولانا سندھی نے ''جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی'' کانگریسی سوراجیہ کمیٹی کابل، مہابھارت سوراجیہ پارٹی اور حکومتِ موقتہ ہند کے ذمہ دار رکن کی حیثیت سے ہر جگہ ایک ہی جملہ دہرایا ہے، فرماتے ہیں:

''مرکزی حکومتِ ہند (Central Govt. of the Federal Republic of India) کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور نہ اس کو ان مذاہب میں دخل دینے کا حق حاصل ہوگا جو پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کو مانتے ہیں''۔ (پمفلٹ جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی، شائع کردہ بیت الحکمۃ دہلی، مولانا سندھی، صفحہ ۷۵۰) (مولانا عبیداللہ سندھی، پروفیسر محمد سرور سندھ ساگر اکادمی، صفحہ ۴۵۸)

اس کے مقابلے میں علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:

''ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ

حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں یہ ایک نظامِ حکومت ہے.......... اس لیے میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے"۔ (طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۲ء)

ہر دو نقطہ ہائے نظر آپ کے سامنے ہیں، خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ان میں سے کون سا اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ قریب ہے؟ کانگریس کے نزدیک ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلم اور غیر مسلم ایک متحدہ قومیت کے افراد تھے۔ یہی وہ فسوں ہے جس کا شکار مولانا محمود حسن سے لے کر مولانا حسین احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد تک سب لوگ ہوئے۔ مولانا حسین احمد نے دہلی میں ۱۹۳۸ء میں کہا کہ:

"قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں"۔

مولانا کے اس نظریے پر برصغیر کا پورا مذہبی طبقہ چونک اٹھا۔ علامہ اقبال نے بسترِ مرگ پر سے اس نظریے پر یوں تنقید فرمائی:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست
بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

(ارمغانِ حجاز، صفحہ ۲۷۸)

علامہ اقبال کی زندگی میں مولانا حسین احمد خاموش ہو گئے۔ جونہی حضرتِ علامہ اللہ کو پیارے ہوئے انہوں نے ''اسلام اور متحدہ قومیت'' کے نام سے پھر ایک رسالہ لکھ ڈالا اور اس میں تحدّی سے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک تھا' علامہ اقبال غلط تھے۔ چنانچہ مسٹر غلام احمد پرویز نے بروقت اس رسالے کا تعاقب کیا اور غلط وصحیح کو الگ الگ کر دکھایا' پرویز صاحب نے مولانا حسین احمد کو متنبہ کیا کہ اگر چہ علامہ مرحوم ہماری بزم سے اُٹھ گئے ہیں تاہم ان کے ہم خیال اور اسلامی قومیت کے علمبردار بھی محاسبہ کرنے کے لیے موجود ہیں۔ تعجب ہے کہ مکتبِ دیوبند میں اس مسئلے پر کس قدر حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ اندھی تقلید کا کرشمہ ہے یا مغالطہ' اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس یکسانیت کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

مولانا عبیداللہ سندھی آخر دم تک اپنا یہ نظریہ ان الفاظ میں دُہراتے رہے جس کے راوی آج بھی موجود ہیں:

''میں سندھی پہلے ہوں اور مسلمان بعد میں''۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے لاہور میں فرمایا:

''مسٹر جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں' غلط فہمی پر مبنی ہے' میں اس باب میں ان سے متفق نہیں''۔ (Statesman Dated:

19.2.40 بحوالہ طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۷۲ء روزنامہ نوائے وقت ۲۸ دسمبر ۱۹۷۵ء)

ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا:

''ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے' ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے' وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے خود بخود بنا کرتے ہیں اور قسمت کی مُہر اس پر لگ جاتی ہے' ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک

ہندوستانی قوم اور نا قابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں، علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا"۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی نا قابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں"۔

ان کے علاوہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہم نے پاکستان کی مخالفت میں جو کردار انجام دیا وہ نظریات کی اسی یکسانیت کا آئینہ دار ہے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد آہستہ آہستہ اس زود فراموش قوم کو بیوقوف بنانے کے لیے اب یہ مہم شروع کر دی گئی ہے کہ مولانا حسین احمد نے اپنے نظریے سے رجوع کر لیا تھا یا علامہ ان کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے تھے، یہاں تک کہ علامہ طالوت اور شورش کاشمیری ایسے پڑھے لکھے اور باخبر حضرات بھی یہی راگ الاپتے رہے۔ ان کی خدمت میں سوائے اس کے اور کیا عرض کریں کہ حقائق کا چہرہ اتنی جلدی مسخ نہیں ہو سکتا۔

اس سے بڑھ کر جب ان علماء نے گاندھی جی کو جامع مسجد شیخ خیر الدین امرتسر میں منبرِ رسول پر بٹھایا (مقالاتِ یومِ رضا، مضمون فاضل بریلوی کے رفقاء کی سیاسی بصیرت، از حکیم محمد موسیٰ امرتسری) اور اس کے ذریعے اسلام کی امداد کی دعا کی گئی اور گاندھی کی جے کے نعرے لگوائے گئے تو مسلم قومیت کے علمبردار فاضل بریلوی چیخ اُٹھے، آپ نے فرمایا:

"جب ہندوؤں کی غلامی ٹھہری پھر کہاں کی غیرت اور کہاں کی خودداری؟ وہ تمہیں ملیچھ جانیں، بھنگی مانیں، تمہارا پاک ہاتھ جس چیز کو لگ جائے گندی ہو جائے، سودا

بیچیں تو دور سے ہاتھ میں ڈال دیں............ حالانکہ بحکمِ قرآن خود وہی نجس ہیں اور تم نجسوں کو مقدس مُطہّر بیت اللہ میں لے جاؤ، جو تمہارے ماتھا رکھنے کی جگہ ہے وہاں ان کے گندے پاؤں رکھواؤ، مگر تم کو اسلامی حِس ہی نہ رہا، محبتِ مشرکین نے اندھا بہرا کر دیا، ان باتوں کا ان سے کیا کہنا جن پر ''حبّک الشئیِ یُعْمی ویُصِم'' کا رنگ بھر گیا، سب جانے دو، خدا کو منہ دکھانا ہے یا ہمیشہ مشرکین ہی کی چھاؤں میں رہنا ہے، جواز تھا تو یوں کہ کوئی کافر............ مثلاً اسلام لانے یا اسلامی تبلیغ سننے یا اسلامی حکم لینے کے لیے مسجد میں آئے یا اس کی اجازت تھی کہ خود سر مشرکوں نجس بت پرستوں کو مسلمانوں کا واعظ بنا کر مسجدوں میں لے جاؤ؟ اُنہیں مسندِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر بٹھاؤ............ کیا اس کے جواز کی کوئی حدیث یا کوئی فقہی روایت تمہیں مل سکتی ہے؟ حاشا ثم حاشا اللہ انصاف! کیا یہ اللہ و رسول سے آگے بڑھنا، شرعِ مطہّر پر افتراء گھڑنا احکامِ الٰہی دانستہ بدلنا سؤر کو بکری بتا کر نگلنا نہ ہوگا''۔ (المحجۃ المؤتمنۃ، صفحہ ۸۴)

نظریات کا یہی وہ اختلاف ہے جس میں اعتقادی مباحث کی طرح سوادِ اعظم کی اکثریت سیاسی پلیٹ فارم پر بھی مکتبِ دیوبند سے الگ ہوگئی۔ انگریزی سامراج سے نجات حاصل کرنے کی تحریک یقیناً ایک عظیم تحریک تھی لیکن اگر یہ تحریک صرف وطنی بنیادوں پر اُٹھے تو آخر اس کا موازنہ اس تحریک سے کیسے کیا جا سکتا ہے جس کا مطمحِ نظر کتاب وسنت کے مطابق ایک اسلامی ریاست قائم کرنا ہو۔ وطنی بنیادوں پر تو کتنے ہی مسلمان لیڈروں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں مثلاً مصطفےٰ کمال پاشا، خوشحال خاں خٹک، پیر سید صبغۃ اللہ شاہ، پیر پاگارا شہید کے نام اسی ضمن میں آتے ہیں لیکن آج کسی میں اتنی جرأت ہے کہ وہ ان کی مساعی اور کوششوں کو اسلامی جہاد یا کسی نوعیت سے اسلامی خدمت قرار دے سکے؟ اگر نہیں ہے تو کس بل بوتے پر مکتبِ

دیو بند کے علماء اور شورش کاشمیری ایسے صحافی جن سے تحریکِ پاکستان اور آزادی کا کوئی گوشہ مخفی نہیں، پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا ابوالحسنات قادری اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں کا ذکر قدح کے بغیر نہیں کرتے۔

فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں کے ہم مکتب علماء و مشائخ کا یہی وہ با اثر گروہ ہے جس نے دامے، درمے، سخنے، قدمے پاکستان کے لیے کام کیا، لاکھوں روپے چندے دیئے، دن رات کا آرام حرام کیا، برصغیر کے کونے کونے میں پہنچ کر رائے عامہ کو ہموار کیا، ہر قسم کی تکالیف برداشت کیں۔

سرحد میں پیر مانکی شریف، پنجاب میں پیر جماعت علی شاہ علی پوری اور سندھ میں حضرت شاہ مغفور القادری نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اسے مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ قدآور شخصیتیں اور بلند ہستیاں اسی لیے طاقِ نسیاں کی نذر کی جا رہی ہیں کہ قلم غیروں کے ہاتھ میں ہے یا اس ملک میں مسلم لیگ کا وجود ختم کر دیا گیا ہے؟

یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب ہو یا کوئی شیخ الہند کے منصب پر فائز؟ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ملّی تشخص اور اسلام کے احیاء کے لیے کس نے کتنا کام کیا ہے؟ ہمیں کسی سے ذاتی پرخاش نہیں ہے، یہ تاریخی حقائق ہیں جو سامنے آ کر رہیں گے، ان میں خیانت کرنے والے تاریخ کے طالب علموں کے سامنے جواب دِہ ہوں گے۔

آج کا مؤرّخ اور قاری دونوں بیدار ہیں۔ وہ سلطانی و ملوکی دَور لَد گئے جب مؤرّخ شاہوں کے بارے میں دیومالائی قسم کی کہانیاں لکھ کر انہیں خوش کر دیتے اور قارئین اسے افیون سمجھ کر لطف اندوز ہوتے رہتے، اب ہر بات پر غور ہوتا ہے، ہر بیان کو عقل و نقل کے مصدّقہ اصولوں پر پرکھا جاتا ہے، اسلام پر ایک گروہ کی اجارہ داری نہیں ہے، کھوٹا مال بھی ہر

جنس میں موجود ہوتا ہے' اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک آدھ آدمی کا سہارا لے کر سوادِ اعظم کی تضحیک کی جائے' فکر و نظر اور اعتقادیات کے اختلافات سدا ہوتے آئے ہیں انہیں وجہ بنا کر تاریخی بد دیانتی صرف وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں قلم کی عظمت اور عصمت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

اس کے ساتھ ہی میں سوادِ اعظم کے پڑھے لکھے اور محبِ وطن طبقے سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ اگر مُردنی اور بے حسی نے پوری طرح ان پر قابو نہیں پالیا تو وہ آگے بڑھیں اور ۱۸۵۷ء سے لے کر قیامِ پاکستان کی تاریخ تک اپنے اسلاف کے قابلِ فخر اور زرّیں کارناموں سے نئی نسل کو روشناس کرائیں۔ اگر انہوں نے اس فرض کی ادائیگی میں غفلت برتی تو وہ وقت دور نہیں جب پاکستان کے نعرے کو ایک وقتی ہنگامی جذبہ اور اس کے لیے قربانیاں پیش کرنے والے علماء و مشائخ کو انگریز دوستی کا لباس پہنا دیا جائے گا جیسا کہ گزشتہ ستّر برس سے یہ عمل جاری ہے۔

پاکستان کے حقیقی خیر خواہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے' آج جبکہ پاکستان کی نظریاتی سرحدیں خطرے میں ہیں' چاروں طرف سے وطنیت کا عفریت پھنکار رہا ہے' ضرورت ہے کہ سوادِ اعظم کے وہی پیشوا رہنمائی کریں جنہوں نے اس فسوں کو توڑ کر یہ ملک حاصل کیا تھا۔ اس وقت حجرہ نشینی اور وقت کی آواز سے اغماض ایک ایسا ملّی و مذہبی جرم ہوگا جس کا خمیازہ مدتوں مسلمان قوم برداشت کرتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

بہ آں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند

قیامِ پاکستان کے اصل محرکات اور اسباب کیا تھے؟ اس سوال کے جواب میں آج بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ پاکستان کے مخالف تو اپنی جگہ رہے خود پاکستان کے ذمہ دار افراد اور نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت کے ذہن بھی اس بارے میں صاف نہیں ہیں' اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قومی سطح پر ان باتوں کے فروغ کا ہم آج تک صحیح انتظام نہیں کر پائے' کوئی اُسے ہندو استحصال کا نتیجہ قرار دیتا ہے تو کوئی معاشی مجبوری' کوئی پاکستان کو قائداعظم کی ذاتی اَنا کا مسئلہ سمجھتا ہے تو کوئی دوسرا اسے انگریز کی سازش؟ اس ژولیدہ فکری اور ذہنی طوائف الملوکی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اصل منزل کے بارے میں ہم خود شک وشبہ میں مبتلا ہو گئے ہیں گویا ع

شد پریشان خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ پاکستان کا مطالبہ ہم نے کسی مجبوری' دباؤ یا اَنا کے تحت نہیں کیا بلکہ یہ ہمارا دینی اور اسلامی تقاضا تھا۔ ہمیں اسلامی احکام' روایات اور اپنی علیحدہ تہذیب وتمدن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک الگ خطۂ زمین کی ضرورت تھی جس کا ہم نے مطالبہ کیا' یہ بات نظریۂ پاکستان کے خالق علامہ اقبال اور پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے بیانات' اور تحریری دستاویز کی شکل میں ہمیشہ واشگاف اور کھلے الفاظ میں بیان کی ہے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے خاتمے کے بعد اگر چہ کلیتاً مسلمان قوم میں آزادی کے شرارے ختم نہیں ہوئے تھے تاہم مسلمانان برصغیر کی اجتماعی لیڈرشپ انتہائی بحران کا شکار تھی'

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب کبھی مسلمان قوم تنزل و انحطاط کی انتہائی پستیوں میں جانے لگی ہے تو قدرت نے اپنی فیاضی سے ضرور کوئی نہ کوئی ایسا صاحبِ دل و دماغ پیدا کر دیا ہے جس نے اس میں نئی روح پھونک دی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد بظاہر اُمید کی کوئی ایسی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی مگر اس آخری دور میں بھی قدرت نے علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح ایسی شخصیتیں پیدا کر دیں، ممکن ہے ہمارے مذہبی طبقے کو یہ بات ناگوار محسوس ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس پچھلے دور میں مسلمانانِ برصغیر کی فکری و عملی قیادت و سیادت کی جو صلاحیتیں اور توفیق علامہ اقبال اور قائداعظم کو نصیب ہوئیں وہ دوسرے حضرات کے حصے میں نہ آسکیں، زاہدانہ وضع قطع اور دیگر اخلاقی فضائل اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں مگر زوال پذیر قوموں کی قیادت یا اُن کی نشاۃ ثانیہ ایسے عظیم کاموں کے لیے صرف باتیں کافی نہیں ہوتیں۔ قیامِ پاکستان تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں اور نہ ہی وہ لوگ کچھ کم اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے اس تحریک کو پروان چڑھایا اور منزلِ مقصود تک پہنچایا۔ یہ تحریک کیوں اُٹھی؟ کن کن مراحل سے گزری؟ اس میں کس نے کیا کردار ادا کیا' یہ وہ سوال ہیں جن کے جوابات صرف ہماری تاریخ ہی کا حصہ نہیں بلکہ پاکستان کی نشوونما' اُس کے تہذیبی ارتقاء اور اسے فلاحی مملکت میں تبدیل کرنے کے عزائم سے بھی اُن کا گہرا ربط ہے۔

مثبت یا منفی طور پر ہمیں ایسی تمام شخصیات یا جماعتوں کا ذکر لازماً کرنا پڑتا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح تحریک پاکستان سے تعلق رہا ہے' اس میں چیں بچیں ہونے اور جواب الجواب کی مناظرہ بازی کی بجائے ہمیں اپنے اپنے کردار کی تصویب و تغلیط کا اپنے اندر آبرومندانہ حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے خاتمے کے بعد ہمارا کوئی منظم مذہبی مرکز باقی نہیں رہا تھا' البتہ دارالعلوم دیوبند جو بعد میں قائم ہوا اچھی مرکزیت اختیار کر گیا تھا۔ اس وقت

ہمارا جو مذہبی طبقہ آزادیٔ وطن کی تحریک میں سرگرمی دکھا رہا تھا زیادہ تر اسی مرکز سے وابستہ تھا۔ تحریک آزادیٔ وطن کی حد تک وہ یقیناً مخلص تھا مگر کیا اس تحریک سے اس کا مقصد برصغیر میں کسی اسلامی سلطنت کا قیام تھا؟ اس کا جواب نفی میں ہے، اگر بے جا جسارت نہ سمجھی جائے تو مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ اسلامی سیاست اور اصولِ حکمرانی کے تقاضوں کے بارے میں خود اس کا ذہن صاف نہیں تھا، ہمارے علماء کا یہ طبقہ صرف انگریز سے آزادی کو ہی عین اسلامی فریضہ سمجھ رہا تھا۔ اس کی جگہ ہندو لے لے یا سیکولر اسٹیٹ بنے وہ اس بارے میں کچھ کہنے سننے کو تیار نہ تھا، جناب سید احمد بریلوی اور شاہ محمد اسمٰعیل کی تحریک کو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی پہلی کوشش قرار دیا جاتا ہے مگر اس کے بارے میں مولانا سید حسین احمد دیوبندی کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو:

> ''سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط اور اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو مسلمان دونوں پریشان تھے اس بناء پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور صاف صاف انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کرنا ہے، اس کے بعد حکومت کس کی ہو گی اس سے آپ کو غرض نہیں جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے ہندو یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے''۔ (نقش حیات، ۲:۴۱۹)

ممکن ہے بعض حضرات مولانا کو سید صاحب کا غلط ترجمان قرار دیں تو انہیں ریاست گوالیار کے مدار المہام اور مہاراج دولت رائے سیندھیا کے وزیر اور برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کے نام سید صاحب کے طویل گرامی نامے کا یہ اقتباس غور سے پڑھنا چاہیے:

> ''وقتے کہ میدانِ ہندوستان از بیگانگاں دشمناں خالی گردیدہ و تیرِ سعی ایشاں برحدف مراد رسیدہ آئندہ مناصب ریاست و سیاست بہ طالبین آں مسلم بادو بیخ شوکت و

سطوتِ ایشاں محکم شود وایں ضعفا را از رؤساء و کبار و عظماء عالی مقدار ہمیں قدر مطلوب است کہ خدمت اسلام بجان ودل کنند بر مسندِ مملکت متمکن شوند''۔

(نقش حیات'ا)

ملاحظہ فرمایا آپ نے برصغیر میں اسلامی ریاست قائم کرنے والی پہلی تحریک کا منشور اور لائحہ عمل' غالباً یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس کے بارے میں علامہ مرحوم نے فرمایا تھا:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قیامِ پاکستان کے اسباب' محرکات اور اقبال و جناح کے عظیم الشان کارنامے کو سمجھنے کے لیے آپ کو اس تحریک کا سارا پس منظر دیکھنا ہوگا' اس لیے میں معذرت کے ساتھ مختصر جائزہ پیش کرتا ہوں۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد مسلمانوں کا جو علمی مرکز یعنی دارالعلوم دیوبند وجود میں آیا' اس نے جو اجتماعی ذہن پیدا کیا اسلامی سیاست کے بارے میں وہ عجیب طرح کی پراگندگی اور انتشار کا شکار تھا' اُس نے براہِ راست ٹکر کی پالیسی کے برعکس مفاہمت اور موافقت کا طریقہ اختیار کیا' یہ مفاہمت کبھی انگریز سے ہوئی تو کبھی ہندو سے!

پروفیسر محمد سرور کا بیان ہے:

''تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لیے ہندو ہنگامی دہشت پسندوں نے جو زبردست جدوجہد شروع کر رکھی تھی اس سے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان بھی کافر متاثر تھے' دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ ہر دو میں انگریز دشمنی کے باغیانہ جذبات اُبھر رہے تھے لیکن اتفاق سے دونوں درس گاہوں کے ارباب اہتمام اور اصحابِ اختیار سرکار پرست تھے' اب یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ مولانا محمد قاسم جو انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں لڑے' ان

کے صاحبزادے حافظ محمد احمد جو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، شمس العلماء کا خطاب قبول کرتے ہیں اور انگریزی حکومت کی طرف سے اڑھائی سو روپیہ ماہانہ بطور وظیفہ مقرر ہوتا ہے، اسی سلسلہ میں گورنر یوپی دارالعلوم میں گیا''۔

(افادیت وملفوظات، مولانا عبیداللہ سندھی، صفحہ ۳۸۷)

اس کے ساتھ ہی لگے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کے سرکاری ترجمان ماہنامہ القاسم ۱۳۲۸ھ سے دارالعلوم کے سالانہ جلسہ کی یہ رپورٹ بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

''مسلمانوں کو ان کے مذہب میں وفاداری کی تعلیم دی گئی ہے، ادھر گورنمنٹ کے بے حد احسانات اس کو مقتضی ہیں کہ مسلمان جان ودل سے ان کا شکریہ ادا کریں اور ایک ایسے کثیر التعداد مجمع میں جس میں ملک کے اعلیٰ وادنیٰ طبقات کے مسلمان موجود ہوں، علماء کی جانب سے جن کی تعلیم کو ہر فرد مسلمان مانتا ہے وفاداری و شکرگزاریٔ گورنمنٹ کا اعتراف واعلان ضرور امر تھا۔ اوّل مہتمم صاحب نے اپنی مطبوعہ تقریر میں نہایت خوبی سے سامعین کے ذہن نشین کیا اور پھر اس کی تائید میں مولانا احمد حسن صاحب، مولانا عبدالحق صاحب، مولوی ظہور علی احمد صاحب نے مدلّل وپُرمغز تقریریں کیں اور بالاتفاق رائے حضور وائسرائے بہادر اور لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی خدمت میں تار دیئے گئے''۔ (رسالہ القاسم، سال ۱۳۲۸ھ، مطبوعہ دارالعلوم دیوبند)

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق متحدہ ہندوستان کی سی آئی ڈی کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

''ریشمی خطوط میں جو نام آئے ہیں اُن میں سے کچھ ناموں کو ہم اس وقت پوری طرح نہیں سمجھ سکے تھے جب ہم نے انڈکس تیار کی تھی اب صوبہ جات کی سی آئی ڈی کی مدد سے ہم نے ان میں سے بعض ناموں کے بارے میں تفصیل حاصل کرلی ہے

چنانچہ حکیم جمیل اور امیر شاہ جنہیں عبید اللہ نے خدام کے خلاف بدگوئی کا بگلچی قرار دیا ہے ان دونوں سے صوبہ جات متحدہ کی سی آئی ڈی بخوبی وقف ہے' یہ دارالعلوم دیو بند کے وفادار پرنسپل کے وابستگان میں سے ہیں۔

(تحریک شیخ الہند انگریزی سرکار کی زبان میں' مرتبہ: مولانا محمد میاں' ۲۱۰' مکتبہ رشیدیہ)

دستخط سی' آر' کلو لینڈ ۹/۱۶/۱

ہم یہ باتیں کسی مخالفت یا مخاصمت کے جذبے سے نہیں لکھ رہے' یہ ہماری تاریخ ہے اس کو گڈمڈ کیا جا رہا ہے اور اس کے ذریعے اقبال اور جناح کے کارناموں کو بتدریج بے وقعت کیا جا رہا ہے' ہمارا مقصد اس سے صرف یہ ہے کہ اس دور کے تمام مذہبی وسیاسی طبقوں اور جماعتوں کے نقطہ ہائے نظر آپ کے سامنے وضاحت سے پیش کریں اور اس کے ساتھ جناح واقبال کے فکر پر مختصر سی روشنی ڈالیں تاکہ ہمیں پاکستان کی تحریک سے مکمل آگہی حاصل ہو سکے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے ''احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' کے عنوان سے مدرسہ دیو بند کے سرکاری ترجمان ماہنامہ ''دارالعلوم'' میں قسط وار ایک طویل مضمون لکھا تھا' وہ رقم طراز ہیں:

> ''میری رائے یہ ہے کہ اربابِ دارالعلوم اس تحریک (آزادیٔ وطن) کو سب سے زیادہ ناپسند کرتے تھے' اسی وجہ سے انہوں نے حضرت مولانا سندھی (مولانا عبید اللہ) کو دارالعلوم سے نکالنے کے لیے بہانے تلاش کئے تھے''۔

(ماہنامہ ''دارالعلوم'' جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ قسط: ۱' احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''دیو بند مدرسہ کے کارکنان مولانا سندھی سے خوش نہ تھے کیونکہ یہ انگریزوں کا دشمن حضرت شیخ الہند کا صحیح تابعدار اور پیروکار تھا۔ اُن کے خیال میں مولانا شیخ الہند کو اس

نے بگاڑ دیا تھا''۔

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مولانا سندھی کو دارالعلوم کی چار دیواری سے نکالنے کے لیے مولانا عزیز الرحمٰن کے الفاظ میں یہ چال چلی گئی' چنانچہ اربابِ اہتمام نے چند مسائل کھڑے کئے اور مولانا کشمیری اور علامہ عثمانی کی ٹکر علامہ سندھی سے کرادی۔ دیوبند میں ان سہ حضرات کے درمیان مناظرہ ہوا جو حقیقت میں مولانا سندھی کے نکالنے کے لیے ایک بہانہ تھا۔

چنانچہ علامہ سندھی کے خلاف ایک ہلڑ بازی کھڑی کردی گئی اور ان کی پوزیشن ملک میں مجروح کرنے کی کوشش کی گئی''۔

(ماہنامہ ''دارالعلوم'' جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ' قسط: ۱' احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن)

مولانا عبیداللہ سندھی کا جرم کیا تھا؟ جس کی وجہ سے انہیں یہ سزادی جارہی تھی' ظاہر بات ہے کہ وہ انگریز کے دشمن اور تحریک آزادی کے سرگرم کارکن تھے' اگر خود دارالعلوم بھی آزادئ وطن کے مجاہدین کی چھاؤنی تھا تو مولانا سندھی پر یہ خفگی کیسی؟ اس کے ساتھ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے یہ الفاظ غور سے پڑھیے' صحیح حقائق آپ کے سامنے آجائیں گے:

''مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں سرکشی کا آغاز عبیداللہ سے ہوتا ہے یہ شخص نومسلم سکھ ہے اس نے ۸۹۔۱۸۸۱ء کے درمیان مدرسہ میں تعلیم پائی' ۱۹۰۹ء میں استاذ بن کر مدرسہ میں غداری پیدا کرنے کے ارادہ سے شامل ہوا' ۱۹۱۳ء میں غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کرنے کی تلقین پر اس کو برطرف کردیا گیا لیکن اس دوران اس نے صدر مدرس محمود حسن کو اپنا ہم عقیدہ بنالیا''۔ (تحریک شیخ الہند انگریزی سرکار کی زبان میں' صفحہ ۲۰۸)

دارالعلوم دیوبند میں تحریک آزادئ وطن کی اسپرٹ مولانا سندھی نے پیدا کرنے کی کوشش

کی جس میں کسی حد تک انہیں کامیابی بھی ہوئی اور کچھ لوگ جن میں مولانا محمود حسن صاحب، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہم کا حلقہ شامل ہے انہوں نے ہم خیال بھی ہوئی مگر مجموعی حیثیت سے دارالعلوم کے اربابِ بست و کشاد نے اس تحریک کو ناپسند کرتے ہوئے خود مولانا سندھی کو دارالعلوم میں بگاڑ اور انتشار کا باعث قرار دے کر دارالعلوم سے نکال دیا۔ دارالعلوم دیوبند کی تحریک آزادیٔ وطن کے گڑھ کی حیثیت سے جو تشہیر کی گئی ہے وہ ساری مولانا سندھی کی رہین منّت ہے مگر مولانا کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس کی معمولی سی جھلک آپ نے ملاحظہ فرمالی۔ تاریخی حقائق کو مسخ کرنا ہمارے علماء کی عادت بن گئی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کی سرکردگی میں جو تحریک چلائی وہ ساری کی ساری متحدہ ہندوستان میں ایک سیکولر حکومت کی ناکام کوشش تھی اس کے تمام پروگراموں میں وضاحت کے ساتھ بیان کی گیا ہے کہ اس حکومت کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ حکومت موقتہ ہند کے نام سے افغانستان میں جو متوازی حکومت قائم کی گئی اس کے لائف پریذیڈنٹ معروف متعصب سکھ لیڈر راجہ مہندر پرتاب مقرر ہوئے۔ یہ وہی مہندر پرتاب ہیں جن کے متعلق ان کے رفیق کار ظفر حسن ایبک کا بیان ہے کہ وہ ہندوستان کے آزاد ہونے پر وہاں ایک ہندو حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ (آپ بیتی ظفر حسن ایبک، حصہ اوّل: ۱۰۰)

اور یہی وہ راجہ صاحب ہیں جنہوں نے ۱۹۵۰ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ:

''جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہوا جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کرسکتا حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جارہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لائنفک ہوگئی ہے بنابریں میں حکومت ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کردے''۔ (ویر بھارت، ۳۱/۲۱/۵۰)

یہ مسلمانانِ برصغیر کی بدقسمتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد اُن کا جو مضبوط علمی مرکز سطح پر اُبھرا اُس نے اسلامی حکومت کے قیام میں ان کی رہنمائی کی بجائے اُلٹا مخالفت شروع کردی۔ انگریز اور ہندو تو مخالف تھے ہی لیکن گھر کی یہ مخالفت مسلمانوں کو زیادہ مہنگی پڑی۔

ع چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آسکی کہ ایک الگ خطّہ زمین کے بغیر متحدہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کے علی الرغم ہمارے یہ علماء کس طرح اسلامی حکومت قائم کرتے؟ یا ہندوؤں کے ساتھ مل کر جو حکومت بنتی (جس میں ظاہر ہے اکثریت ہندوؤں کی ہوتی) کس نوعیت سے اسلامی حکومت دی جاسکتی؟ بہرحال یہ بات مسلّم ہے کہ متحدہ قومیت کا نعرہ شاید اپنے اندر کوئی ایسی جاذبیت رکھتا تھا جس نے اس مرکز کے بیشتر علماء کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

مولانا حسین احمد مدنی دیوبندی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ:

''اس زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں''۔

ایک مرکزی دینی ادارے کا اہم رکن کی جانب سے یہ اعلان کوئی معمولی بات نہ تھی، علامہ اقبال اس وقت بسترِ مرگ پر تھے مگر وہ تڑپ اُٹھے اور فرمایا: ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست (ارمغانِ حجاز)

اس عالمانہ تنقید پر مولانا مدنی نے اپنے بیان کی جو توضیح کی جو اس سے بھی زیادہ مغالطہ آمیز، گمراہ کن اور عذر گناہ بدتر از گناہ کا مکمل نمونہ تھی۔ مولانا نے کہا کہ:

''موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل اور مذہب سے۔ قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجۂ جامعیت ہو خواہ وہ مذہب ہو یا وطنیت یا نسل یا پیشہ یا رنگت یا کوئی اور صفت معنوی یا مادی وغیرہ۔ یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کی بجائے شرفِ انسانی اور اخوت بشریٰ پر رکھتی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ کون سی نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے''۔ (مدینہ بجنور ۲۱ فروری ۱۹۳۸ء)

حضرت علامہ مرحوم کی صحبت میں بیٹھنے والے افراد کا بیان ہے کہ مولانا مدنی کے اس بیان کو پڑھ کر حضرت علامہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے اور کہتے تھے:

''الٰہ العالمین! اس ہندوستان میں تیرے اس پیغامِ ازلی کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ جہاں کے مفتیانِ دین متین اور حامیانِ شرع متین کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اس نظریہ کا اسلامی نظریہ قرار دے رہے ہیں جس باطل نظریہ کو مٹانے کے لیے اسلام آیا اور جب تک عملاً اُسے فنا نہیں کر دیا گیا دین کی تکمیل اور اتمامِ نعمت کا اعلان نہیں ہوا''۔ (متحدہ قومیت اور اسلام، ۳:۴)

علامہ اقبال کی وفات کے بعد جب مولانا مدنی نے دوبارہ اپنے مؤقف پر اصرار کیا تو جناب غلام احمد پرویز جو قائداعظم کے معتمد اور شروع ہی سے تحریکِ پاکستان کے زبردست حامی اور کارکن تھے، میدان میں آئے اور مولانا مدنی کی تردید میں متحدہ قومیت اور اسلام کے نام سے مدلّل مضمون لکھا۔

ایک اور موقعہ پر مولانا مدنی نے فرمایا:

''ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیے اور ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے''۔

(زمزم ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

دوسری طرف علامہ اقبال نے فرمایا کہ:

''اسلام ایک ایسا نظامِ خداوندی ہے جو اپنے ساتھ کسی غیر خداوندی نظام کو گوارا نہیں کرسکتا، غالباً اسی موقعہ پر علامہ نے فرمایا تھا:

فقیہش بے یقینے کم سوادے بآں قوم از تو مے خواہم کشادے
مرا اے کاشکے مادر نہ زادے بسے نادیدنی را دیدہ ام من

مولانا ابوالکلام آزاد نے لاہور میں فرمایا:

''مسٹر جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں غلط فہمی پر مبنی ہے، میں اس باب میں ان سے متفق نہیں''۔

(States Man Dated 19-2-40)

دوسرے موقعہ پر آپ نے فرمایا:

''میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں''۔

مولانا سندھی آخر دم تک اپنا یہ نظریہ ان الفاظ میں دُہراتے رہے:

''میں سندھی پہلے ہوں اور مسلمان بعد میں''۔

اس کے علاوہ مجلس احرار، جمعیۃ الانصار، جمعیۃ علماء ہند، خاکسار، سرخپوش اور فدائی خدمتگار کے قافلے کے قافلے اسی نظریے کی تائید میں پاکستان کی مخالفت میں اُٹھ کھڑے ہوئے، اگر بات صرف نظریات کے اختلاف کی ہوتی تو خیر تھی یہاں تو پوزیشن یہ تھی کہ ہم پاکستان نہیں بننے دیں گے! ان حالات میں قائداعظم محمد علی جناح کو جو چومکھی لڑائی لڑنا پڑی آپ بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

اسلامی حکومت کے بارے میں علماء کے اس طبقے کی ژولیدہ فکری کے ساتھ ساتھ اگر اس تحریک ریشمی رومال، تحریکِ ہجرت افغانستان، حکومت موقتہ ہند پر نظر غائر ڈالیں تو آپ کو ان کی سادہ لوحی پر تعجب ہوگا۔ اپنی نیت میں آزادیٔ وطن کی حد تک وہ یقیناً مخلص ہوں گے مگر عملی پر ان تحریکوں کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں سوائے ''نقصانِ مایہ و شماتتِ ہمسایہ'' کے اور کچھ نہ تھا۔ ترکی میں پاکستان کے ایک سابق پریس اتاشی جناب شریف الحسن نے مولانا سندھی کے دیرینہ رفیق جناب ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی پر مقدمہ لکھتے ہوئے بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ اُن کا کہنا ہے:

''حیرت در حیرت کا مقام ہے کہ ہمارے زعماء اور علماء اس وقت کے افغانستان سے کس قدر دور از کار حسن ظن اور لاطائل امید رکھتے تھے، بھلا جس ملک کی آبادی اس وقت ۸۰ لاکھ بمشکل ہو، سوادِ اعظم جاہل و مفلس ہو، فوج غیر منظّم بلکہ بے سُری اور سرکش ہو، سردارانِ فوج حتیٰ کہ ان کے سپہ سالار ایک کے سوا سب کے سب فوجی تربیت سے عاری اور علم سوق الجیش سے نابلد ہوں، خزینہ تہی ہو اور توپ و تفنگ و جدید اسلحہ جنگ نیز گولہ بارود قریب قریب مفقود ہو، وہ کس طرح بیس کروڑ نفوس پر

مشتمل ہندوستان جیسے وسیع و عریض برصغیر کو برطانیہ جیسی جہاں گیرو جہاں دار قوت کے چنگل سے چھڑا سکتا تھا۔ چڑیا کا پھندا تو تھا نہیں جو کوئی ایسی سکھی ویسا سکھی چھڑا دیتا۔ تحریک ہجرت کا سانحۂ ہائلہ الگ عبرتناک ہے اور ہندی مسلمانوں کی سادہ لوحی و خودفریبی کی آپ مثال ہے، محلِ استعجاب ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ اور نام نہاد قائدین ملّت اور زعمائے اُمت بین المللی سیاست سے کس درجہ ناآشنا اور ممالک اسلامی کے حق میں کس قدر خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔

اِنْ کُنْتَ لَا تدری فتلك مصيبةٌ

وَاِنْ کُنْتَ تدری فالمصيبةُ اعظمُ

(مقدمہ آپ بیتی' ظفر حسن ایبک)

یہ ہیں ہمارے اس مذہبی طبقے کے مختصر نظریات جو اس وقت مسلمانوں کی علمی و سیاسی قیادت کا مدعی تھا اس کے مقابلے میں سواد اعظم تھا جس میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے اگرچہ ان کی کوئی باقاعدہ تنظیم نہ تھی تاہم ایک آدھ آدمی کو چھوڑ کر وہ قدیم حنفی خیال کا پیرو' دوقومی نظریے کا علمبردار اور اقبال و جناح ایمان و دل سے شیدائی تھا۔ نظریۂ پاکستان اُس کا ایمان اور قیامِ پاکستان اس کی واضح منزل تھی۔

ممکن ہے آپ کو یہ خیال ہو کہ برصغیر میں متحدہ حکومت گو اسلامی نہ ہوتی تاہم شاید وہ اس ملک کے باشندوں کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتی جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے اور حال ہی میں ترقی پاکستان کی علیحدگی کے وقت بعض سرکردہ لیڈروں کو یہ کہتے سنا گیا کہ (ہم پاکستان بنانے کے جرم میں شریک نہیں تھے) تو آپ ہندو ذہنیت اور ضمیر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیں اور خود ہی فیصلہ کرلیں کہ اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بنتا تو برصغیر میں مسلمانوں کے مستقبل کا حشر کیا ہوتا؟

مہاتما گاندھی نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ:

''میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیوں کہ میں ویدوں اپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں، اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ کے عقیدہ پر یقین رکھتا ہوں، میں گاؤ رکھشا کو اپنے مذہب کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا، میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے''۔ (اکابر تحریک پاکستان، حصہ اوّل:۱۴)

گاؤ رکھشا کے بارے میں ۱۹۱۸ء میں انہوں نے کہا:

''یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یورپین کے لیے گاؤ کشی جاری رکھنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے، میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤ کشی سے آزاد کرانے کی اُمید نہ رکھتا ہو۔ ہندومت، عیسائی یا مسلمان کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے سے تامل نہیں کرے گا کہ وہ گاؤ کشی بند کریں''۔ (الفضل ۱۸-۳-۹، بحوالہ اسٹیٹسین)

پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کانگرس منعقدہ ۱۹۳۷ء کے خطبۂ صدارت میں کہا:

''ایسے لوگ بھی زندہ ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے، جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں''۔ (میری کہانی، ۲:۲۳۲)

ڈاکٹر رادھا مکرجی نائب صدر ہندو مہا سبھا و صدر کانگرس بنگال نے کہا:

''ہندوستان کو نظریہ اور عمل کے لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیے جس کا مذہب ہندو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو''۔ (طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۳۸ء)

کانگرس نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۸۸۵ء میں اپنا پہلا اور ضروری مقصد ان الفاظ میں ظاہر کیا:

''ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا''۔ (متحدہ قومیت اور اسلام' ۶)

پنڈت جواہر لال نہرو مذہب کے بارے میں یوں گویا ہوئے:

''جس چیز کو مذہب یا منظّم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان یا دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے' قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اُٹھانے کا قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقا کا حمائتی ہے''۔ (میری کہانی' ۱۶۱)

۱۵ دسمبر ۱۹۴۴ء کو مہاتما گاندھی نے قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا:

''میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں' اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم رہنا چاہیے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو''۔

یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ ہم نے ہندو لیڈروں کے صرف ان بیانات کے نمونے پیش کئے ہیں جو پریس میں آئے۔ ہندو کی یہی وہ منافقانہ پالیسی تھی جس کے بارے میں حضرت علامہ نے فرمایا تھا: ؎

درِ صد فتنہ را بر خود کشادی — دو گامے رفتی و از پا فتادی

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست — تو قرآں را سر طاقے نہادی

اگر متحدہ حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں پر کیا گزرتی؟ اس سلسلے میں خود جمعیۃ العلمائے ہند کے سابق سیکرٹری مولانا احمد سعید کی رائے ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

''اسلامی حکومت کے زوال پر اگر اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آ جاتا جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے حکمران بن کر خدا جانے وہ مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتی''۔ (الجمعیۃ، جنوری ۱۹۲۶ء)

ان حالات کو دیکھ کر دردمند مسلمان بے چین اور مضطرب تھے۔ دیوبند کے پورے مکتب فکر میں مولانا اشرف علی تھانوی نے نظریاتی طور پر اپنے گروہ سے اختلاف کیا تو انہیں فوراً انگریز دوستی کا خطاب عطا کر دیا گیا۔ ملاحظہ ہو:

''مولانا سندھی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے علم و فضل اور ارشاد و سلوک میں انہیں جو بلند مقام حاصل تھا، اُس کے تو قائل تھے لیکن تحریک آزادی ہند کے بارے میں ان کی جو معاندانہ اور انگریزی حکومت کے حق میں مؤیدانہ روش رہی، اس سے وہ بہت خفا تھے''۔ (افادات و ملفوظات مولانا عبیداللہ سندھی، ۳۸۲)

مولانا تھانوی کے حلقے کے ایک اور عالم مولانا شبیر احمد عثمانی نے مولانا تھانوی کی ہمنوائی کی تو انہیں ابوجہل تک کہہ ڈالا گیا، ان کا جنازہ نکالا گیا، ان کے کارٹون دیواروں پر چسپاں کئے گئے۔ (مکالمۃ الصدرین، ۳۲:۴۴) یہ سب کچھ کہیں باہر نہیں خود دارالعلوم دیوبند میں ہوا۔ ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت کا یہی وہ جرم ہے جس کا ارتکاب مولانا احمد رضا بریلوی نے کیا: انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے آزادی اور اُس کے بعد متحدہ حکومت کو مسلمانانِ برصغیر کے لیے اپنی ہلاکت کے

پروانے پر دستخط کرنا قرار دیا، انہوں نے ببانگ دُہل اس اتحاد کو غلط قرار دیا، چنانچہ مولانا محمد علی (جوہر) اور مولانا شوکت علی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو انہوں نے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا: مولانا! میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے، آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں، میں مخالف ہوں۔ پھر فرمایا: مولانا! میں ملکی آزادی کا مخالف نہیں، ہندو مسلم اتحاد کا مخالف ہوں۔

جب ان حضرات نے گاندھی جی کو جامع مسجد شیخ خیر الدین کو امرتسر میں منبر پر بٹھایا تو مولانا بریلوی چیخ اُٹھے اور فرمایا:

"جب ہندوؤں کی غلامی ٹھہری پھر کہاں کی غیرت اور کہاں کی خودداری۔ وہ تمہیں ملیچھ جانیں بھنگی مانیں تمہارا پاک ہاتھ جس چیز کو لگ جائے گندی ہو جائے، سودا بیچیں تو دور سے ہاتھ میں ڈال دیں...... حالانکہ بحکم قرآن خود وہی نجس ہیں اور تم نجسوں کو مقدس مطہر بیت اللہ میں لے جاؤ.......... مگر تم کو اسلامی حس ہی نہ رہا محبت مشرکین نے اندھا بہرا کر دیا" الخ۔ (الحجۃ المؤتمنہ، ۸۴)

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

نیشنلسٹ علماء نے جس طرح ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت کے جرم میں مولانا عثمانی اور مولانا تھانوی کو انگریز دوستی کی تہمت سے نوازا، بالکل اسی گناہ میں نہ صرف فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان بلکہ حکیم الامت علامہ اقبال اور قائداعظم ایسی بے لچک اور بے داغ شخصیتوں کو بھی داغدار کرنے کی کوشش کی گئی حالانکہ شاہ محمد اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی سے لے کر اکابر دیوبند و اہل حدیث تک ہر قابلِ ذکر شخصیت نے نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کا علم بلند کیا بلکہ انگریزی حکومت سے اُلجھنے کی بجائے کنّی کترا کر نکلنے کی راہ اختیار کی ہے، شاید انہیں بلکہ یقیناً ضمیر کی اس خلش کو

دور کرنے کے لیے اب یہ حضرات اپنے ''روشن چہروں'' کو اجاگر کرنے کی بجائے علمائے اہل سنت اور مسلم لیگ کے تابناک ماضی کو دھندلانے کی سعی ناکام میں مصروف ہیں مگر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

خرد کا نام جنون رکھ دیا جنوں کا خرد　　　جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

علامہ اقبال

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات　　　تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

انہی حالات میں قدرت نے علامہ اقبال کو مسلمانانِ برصغیر کی نشاۃ ثانیہ کے معمارِ اوّل کے طور پر پیدا کیا۔ آپ نے مسلمان قوم کو خودی کا درس دے کر خوابِ غفلت سے جگایا اور حکیمانہ انداز سے اسے فراموش کردہ سبق دوبارہ یاد دلایا۔ یہ اس دانائے راز کی بصیرت تھی، جس نے میدان تگ و تاز میں مسلمانوں کی قیادت کے لیے جناح کا انتخاب کیا' آپ نے اپنے ایک خط میں جناح کو لکھا:

''میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرا بار بار آپ کو لکھنا گراں نہیں گزرتا ہوگا' میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملّت اسلامیہ کو اپنی یہ اُمیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے اس کی کشتی کو ثابت و سالم بہ امن و عافیت ساحل مراد تک لے جائیں گے''۔

حکیم الامت کا انتخاب کس قدر صحیح تھا' بعد کے حالات سے اس کا اندازہ لگا لیجئے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں حکیم الامت نے اعلان کیا:

''اگر آج اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو اسلام اور صرف اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیں اور اس زندہ و پائندہ اور قائم و دائم نظریۂ حیات سے جو وہ پیش کرتا ہے

نورِ بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سرِ نو حاصل کر لیں گے اور یوں اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے مہیب جہنم سے بچالیں گے...... میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے، ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو مجھے تو یہ ہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقے کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے.......... اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے.......... اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشو و ارتقاء کا موقع ملے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لیے بیٹھے ہیں اور جس سے اُن کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ ملک میں مستقل طور پر انہی کا غلبہ اور تسلط ہو"۔

سیاسی افراتفری، ذہنی انتشار اور ژولیدہ فکری کے دشت میں یہ آواز آذانِ سحر ثابت ہوئی، مسلمانوں کی واضح اکثریت نے حکیم الامت کے الفاظ کو نشانِ منزل قرار دیا۔

قائداعظم محمد علی جناح

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

یہاں سے قائداعظم محمد علی جناح اپنا محاذ سنبھال لیتے ہیں' اس بات کا غیروں کو بھی اعتراف ہے کہ قائداعظم بااصول' بات کے پکے' قول کے سچے' ظاہر و باطن کے اُجلے اور کسی قیمت پر نہ بکنے والے شخص تھے۔ انہوں نے جس تدبّر' حوصلے اور مستقل مزاجی سے مسلمانوں کے حقوق کی خاطر یہ چومکھی لڑائی لڑی اور جیتی' اس کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے' توڑ پھوڑ' ہنگامے فسادات اور خون ریزیوں سے ایسے مسائل حل ہوتے آئے ہیں مگر اصولوں اور دلائل سے میز پر ایسی اہم لڑائی جیتنا جناح کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر تاریخ انگشت بدنداں ہے

ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

انہوں نے انگریز سے کبھی مفاہمت اور موافقت کا راستہ اختیار نہیں کیا' دسمبر ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں آپ نے انگریزوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ نے ہمارے اختیارات و اقتدار چھین کر ان کی جو اجارہ داری لے رکھی ہے اور ہمیں جن حقوق سے محروم کر دیا ہے وہ ہمیں واپس دے دیں' آپ کو اس اجارہ داری کا ہرگز کوئی حق نہیں ہے''۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور' مضمون قائداعظم بحیثیت سیاستدان از مرغوب صدیقی' ۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء)

ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا:

''میں بڑی خوشی سے یہ تسلیم کرتا ہوں کہ برطانیہ نے ہند کو ترقی دے کر کچھ سے کچھ بنا دیا ہے مگر میں پوری شدت سے یہ دلیل ماننے سے انکاری ہوں کہ چونکہ انگریزوں نے ہند میں تعمیر و ترقی کا کام کیا ہے اس لیے انہیں ہند پر حکمرانی کی ہمیشہ اجارہ داری ملی رہے''۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور' مضمون قائداعظم بحیثیت سیاستدان از مرغوب صدیقی' ۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء)

آخر گاندھی اور نہرو اس سے زیادہ انگریزوں سے اور کون سی بات کہہ سکتے تھے۔ پاکستان

سے متعلق قائداعظم کے نظریات و اساسات کو آج جس طرح بگاڑا جا رہا ہے اور شعوری طور پر جس قسم کی فضا بنائی جا رہی ہے اس سے اصل پاکستان کو ذرا بھی واسطہ نہیں ہے۔ گویا پاکستان سے قائداعظم کا مقصد کسی اسلامی حکومت کا قیام نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کی آزاد حکومت تھا؟ یہ کہ خود قائداعظم کا ذہن اسلامی حکومت کے بارے میں صاف نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا سفید جھوٹ ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ قائداعظم، قرآن مجید اور اسلام کے بارے میں بیشتر نام نہاد علماء سے زیادہ علم رکھتے تھے، انہوں نے ایک اعلیٰ قانون دان اور سکالر کی حیثیت سے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تھا، اسلامی قوانین اور اصولوں کی برتری، جامعیت اور عالمگیری پر صدقِ دل سے یقین رکھتے تھے۔ مولانا غلام مرشد سابق خطیب شاہی مسجد لاہور اور جناب غلام احمد پرویز نے قائداعظم کے قرآن مجید کے ساتھ شغف کے بارے میں جو ذاتی واقعات بیان کئے ہیں، ان کی سو فیصد تصدیق ہمیں اس وقت ہوتی ہے جب کسی اہم دستوری مسئلے میں قائداعظم اسلامی یا قرآنی نقطۂ نگاہ بیان کرتے ہیں۔ پاکستان سے اُن کا مقصد کیا تھا؟ لیجئے! خود ان کی زبانی سُنیے:

۱۹۴۹ء میں فرنٹیر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں فرمایا:

''پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں، اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے، ہم نے صرف آزادی حاصل نہیں کرنی ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں''۔

۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں فرمایا:

''ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں، ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے، ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری

رہنمائی کرتا ہے، ہم اس ضابطہ کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں“۔

۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:

”پاکستان ایک مسلم اسٹیٹ ہوگی“۔ (تقاریر جناح، جلد دوم ۳۲۶)

۱۹۴۱ء میں حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء نے قائداعظم سے ملاقات کی اور بڑی اہم نوعیت کے سوالات پوچھے۔ اورینٹ پریس کے نمائندے نے اس کی رپورٹ مرتب کی۔ اس ملاقات میں قائداعظم سے پوچھا گیا کہ اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکم اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی شخص یا ادارہ کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

کیا اسلامی آئین جہانبانی اور اصولِ حکمرانی کی اس سے بہتر توضیح ممکن ہے؟ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص قائداعظم کے ذہن کو اسلامی حکومت کے تصور کے بارے میں صاف نہیں سمجھتا تو وہ جہل مرکب میں مبتلا ہے؟ یہ نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی اسلام کا کوئی قاعدہ وکلیہ ہے کہ قرآن اور اسلامی سیاست کو سمجھنے کے لیے علماء کی وضع قطع ضروری ہے؟

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر ہاتھ میں لے لے مینا اُسی کا ہے

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقد دہلی ۲۴/ اپریل ۱۹۴۳ء میں قائداعظم نے کہا:

''ہمارے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں، بہت سے فتنے برپا کیے جارہے ہیں، پوچھا یہ جاتا ہے کہ کیا پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوگی؟ ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش آئے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا سوال کرنے والے ہمارے خلاف Vote of Censure پاس کرتے ہیں''۔ (تقاریر جناح، جلد اوّل، ۵۵۵، مطبوعہ شیخ محمد اشرف، لاہور)

۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو قوم کے نام پیغامِ عید نشر کرتے ہوئے فرمایا:

''معاشی احیاء ہو یا سیاسی آزادی اسے آخر الامر زندگی کے کسی گہرے مفہوم پر مبنی ہونا چاہیے اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمارے نزدیک زندگی کا وہ گہرا مفہوم اسلام اور روحِ اسلام ہے''۔ (تقاریر جناح، جلد اوّل، ۱۰۸، مطبوعہ شیخ محمد اشرف، لاہور)

پاکستان کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ ملاحظہ ہو:

''مسلمان اس لیے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں''۔ (تقاریر جناح، جلد دوم، ۳۳۳)

اپریل ۱۹۴۳ء میں صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظم سے ایک پیغام کے لیے درخواست کی تو انہوں نے جواب میں فرمایا:

''تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں، میں تمہیں کیا پیغام دوں! ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری رہنمائی اور بصیرت افروزی کے لیے کافی ہے، وہ پیغام ہے خدا کی کتابِ عظیم قرآن کریم''۔

(تقاریر جناح، جلد اوّل، ۵٦)

جو لوگ قائداعظم کے ساتھ اس تاریخی جدوجہد میں شریک رہے ہیں، مخالف ہوں یا موافق، سب کی متفقہ رائے ہے کہ قائداعظم کی سیاست کا سب سے بڑا اصول یہی تھا کہ وہ اپنے ظاہر و باطن میں قطعاً فرق نہیں رکھتے تھے۔ دورنگی، منافقت، اندر کچھ باہر کچھ، سے وہ ساری زندگی بلند رہے، اس کردار کے آدمی کے بارے میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی معقول آدمی یہ کہہ سکے کہ وہ پاکستان سے ایک اسلامی حکومت نہیں بلکہ مسلمانوں کی ایک سیکولر یا کسی ازم پر مبنی کوئی حکومت بنانا چاہتے تھے اور ہر جگہ اسلام اسلام کا نعرہ انہوں نے محض دکھاوے کی خاطر بلند کیا تھا اور اگر کسی شخص کا یہ نظریہ اور خیال ہے تو وہ علمی زبان میں تفسیر القول ''بما لا یرضیٰ به قائله'' کا مرتکب ہے۔ میں آخر میں پاکستان کے ممتاز صحافی اور قائداعظم کے معتمد ساتھی جناب زیڈ اے سلیری کے مضمون ''ہم نے پاکستان کی قدر نہ جانی'' کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں، اگرچہ اقتباس طویل ہے لیکن اس کی اہمیت دن بدن بڑھ رہی ہے، لکھتے ہیں:

> ''تحریک پاکستان کا انوکھا اور منفرد وقار تو مسلم قومیت کے ساتھ وابستہ تھا جب مسلم قومیت ختم ہوگئی تو پاکستان کے اقدار کا کیا ذکر؟ چنانچہ متعدد قومیتوں کا غلغہ بلند ہونے لگا اور کمیونسٹ ماسکو سے آمدہ کتابوں کا درس پڑھانے لگا کہ بنگالیوں، بلوچیوں، سندھیوں، پنجابیوں اور پٹھانوں کی کیا کیا تاریخی و نسلی و لسانی خصوصیات ہیں اور وہ کس قدر ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہیں، پاکستان ایک فکری تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا، فکر جامد چیز نہیں ہوتا کہ بیٹھ گیا تو بیٹھ گیا، فکر بدل بھی سکتا ہے اور فکر بدلنے کے ہزار طریقے ہوتے ہیں۔ پاکستان میں ہوا یہ ہے کہ یہاں فکری خلاء تو ہم نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے لیکن اس خلاء کو اغیار نے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اب یہاں سوشلسٹ انقلاب کی باتیں ہونے لگی ہیں۔

اگر ہم ظہورِ پاکستان کے منطقی نتیجے یعنی نظامِ اسلام کے نفاذ کو بروئے کار نہیں لائے تو ہم ایک اور اہم جہت میں بھی تغافل کے مجرم بنے اور یہ تغافل ہم نے خود قائد اعظم کی ذات کے متعلق برتا۔ اگر ہم نے اقدار کے فدائی ہونے کا ثبوت نہیں دیا تو کم از کم ایک محبوب ایک محسن کے شیدائی تو ثابت ہوتے کیوں کہ اگر ہم قائد کے وفادار ہوتے رہتے تو بھی ہم اپنی منزل سے دور نہ جا سکتے تھے کیونکہ ان کا پیغام ہی اسلام اور وحدت کا تھا لیکن ہم نے او بدا کر قائد اعظم کی یاد بھلائی تا کہ ہماری گمراہی میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو' اب اگر ہمارے سامنے قائد کی حیات ہوتی تو تحریک پاکستان کی تاریخ کو مسخ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم قراردادِ لاہور کو دو مملکتوں کے مطالبے سے تعبیر نہ کر سکتے اور مسلم قوم کو مختلف النور عناصر کا ملغوبہ نہ قرار دیتے' قائد اعظم کی زندگی کو پردۂ اخفاء میں رکھ کر ہم نے جہاں داخلی طور پر فکری انتشار کی راہ ہموار کی کہ ہر مکتبۂ فکر نے تحریک پاکستان کی جو چاہی تفسیر کی۔ وہاں خارجی طور پر اپنے دشمنوں کو جدوجہد آزادی کی تصویر کو بگاڑنے کیلئے صلائے عام دی۔ چونکہ ہماری طرف سے قائد کی کوئی ایسی سوانح نہیں لکھی گئی جس میں ہر مرحلے اور اقدام کی دستاویزی سند دی گئی ہو' اس لیے ماؤنٹ بیٹن اور دوسرے مخالفین کو ہر قسم کا جھوٹ بولنے کی آسانی ہوگئی۔ اگر ملک کے اندر غفار خان نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے ہمارے لیے آزادی حاصل کی اور آسام کے ہندو وزیر اعلیٰ برودی نے پاکستان بنایا تو انگریز' امریکی اور ہندو مصنفین نے پاکستان کو خالصتاً قائد کی ذاتی ہٹ اور اَنا کا نتیجہ بتایا' جس کی کوئی مثبت بنیاد نہیں' ہمارے ہاں فکری طوائف الملوکی کا یہ حال ہے کہ اب ایسی شہادتیں بھی پیش کی جانے لگی ہیں کہ مولانا ابوالکلام پاکستان کے حامی تھے......

اگر قائد کا صحیح نقش ہمارے دل پر کندہ ہوتا تو ہم اپنے اندر پاکستان کی اقدار سے وہی وابستگی پیدا کرتے جو ان کے کردار کا خاصا تھی، اگر انہوں نے مسلم قومیت کے نظریے پر انگریزوں اور ہندوؤں سے کسی قسم کی مفاہمت نہ کی تو وہ ان بنگالیوں سے بھی نہ دبے جو اُردو کی قومی حیثیت کو نزاعی بنانا چاہتے تھے۔ محبّ الوطنی کے اس ماحول میں کسی پاکستان مخالف جماعت کو سر اُٹھانے کی جرأت نہ ہوتی...... ملک کی اہمیت کو کم کرنے میں اگر مسلم لیگی اور غیر مسلم لیگی حکومتوں نے کام کیا تو جماعت اسلامی نے بھی اس ضمن میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان بنتے ہی اس نے نظامِ اسلام کے نفاذ کا پُر زور مطالبہ کر دیا، اب مطالبہ بجائے خویش غلط نہ تھا لیکن جماعت کے حوالے سے اس کی خصوصی نوعیت ہو گئی تھی۔ جماعت نے نظامِ اسلام کے نفاذ کو ہی برصغیر میں پیش نظر رکھا تھا لیکن اس کے لیے انہوں نے کسی آزاد اور مسلم مملکت کی ضرورت محسوس نہ کی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ ان کے معنوں میں نظامِ اسلام متحدہ ہندوستان میں ہی قائم ہو سکتا تھا خواہ اس ملک کا حکمران انگریز ہو یا ہندو۔ مولانا مودودی مسلمانوں کے ہندوؤں سے الگ قومی تشخص کے ضرور قائل تھے لیکن ان کے لیے وہ کسی قومی مملکت کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے، اس لیے انہوں نے نہ خود کسی آزاد مملکت کا مطالبہ کیا اور نہ تحریکِ پاکستان سے کوئی دلچسپی ظاہر کی لیکن پاکستان میں نظامِ اسلام نافذ کرنے میں انہوں نے بہت جارحانہ اندازِ عمل اختیار کیا اور براہِ راست مسلم لیگ سے مڈبھیڑ کی اور اپنے اس ادعا کو ثابت کرنے پر تلے کہ اس کے لیڈر نظامِ اسلام نافذ کرنے کے اہل نہیں۔ یہ اندازِ عمل اس مؤقف سے بالکل مختلف تھا جو جماعت نے متحدہ ہندوستان میں اختیار کیا تھا اور جو مبلغانہ اور صلح

جو یا نہ تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ جماعت نے یہ اندازِ عمل کیوں اختیار کیا؟ اس کے دو ہی وجوہ ہو سکتے ہیں' یا یہ کہ ایک نو مسلم مملکت میں ہی نظامِ اسلام کے نفاذ کا مقصد شرمندۂ معنی ہو سکتا تھا اور پاکستان بننے کے بعد جماعت کو حوصلہ ملا کہ وہ اب اپنے مشن کو بروئے کار لا سکتی ہے' اب اگر یہ صورت تھی کہ جماعت نے خود آزاد مملکت کو مطالبہ نہیں کیا تھا تو تحریکِ پاکستان کی کامیابی میں کوئی دلچسپی کیوں نہ لی؟ اور اس کی مدد کیوں نہ کی اور اس سے الگ تھلگ کیوں رہی؟ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب پاکستان بن گیا تو سیاست کا یہ تقاضا تھا کہ مسلم لیگ کو پاکستان کی تخلیق کا کوئی کریڈٹ نہ ملے۔ اور اسے دفاعی وانفعالی پوزیشن میں ڈالنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ نظامِ اسلام کے نفاذ کے مطالبے کو بزور پیش کیا جائے کیونکہ اس کی مزاحمت خود اس کے اپنے عقیدے اور مؤقف کی روشنی میں مسلم لیگ کے لیے محال ہوگی' کچھ اس قسم کی چال غفار خان نے سرحد میں استصواب رائے کے خلاف اختیار کی تھی' انہوں نے کہا کہ وہ پختونستان میں قرآنی حکومت قائم کریں گے۔ کہاں غفار خاں اکھنڈ بھارت اور متحد قومیت کے علمبردار اور کہاں وہ پٹھان قومیت اور قرآنی حکومت کے داعی بن گئے۔ مقصد مسلم لیگ کی مخالفت اور پاکستان کی تخریب تھی' اب جماعت مسلم لیگ کو گرانے میں تو کامیاب ہوئی لیکن ساتھ ہی وہ پاکستان کی اہمیت کو کم کرنے میں بھی کامیاب ہوئی۔ جماعت نے پاکستان بنانے کے لیے مسلم لیگ کی خدمات کو کبھی نہیں سراہا۔ بلکہ جب بھی اس کا ذکر کیا طعن و تشنیع کے لیے کیا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی ناگزیر ہو گیا کہ پاکستان کا بننا بہت معمولی واقعہ قرار پایا۔ پاکستان بنانے کے لیے کوئی تعریف و تحسین کا مستحق نہ تھا' خواہ وہ قاید ہو یا مسلم لیگ' اصل چیز

تو نظامِ اسلام کا نفاذ تھا جو نہ ہوا۔ اس طرح پاکستان کی تخلیق کا عدیم المثال معرکہ سیاست کی نذر ہو گیا۔ حالانکہ پاکستان کے بغیر نظامِ اسلام کے نفاذ کا تصور بھی محال تھا۔ چلو مسلم لیگ نے نظامِ اسلام قائم نہیں کیا اور اس کے لیے وہ موردِ الزام سہی لیکن اس کے قیام کا عملی امکان تو پیدا کر دیا۔ اس کے بعد ہی جماعت پاکستان میں اس قدر جوش و خروش سے اس مقصد کے لیے جہاد کر سکی ہے جب کہ متحدہ ہندوستان میں وہ منقاء زیر رہنے پر مجبور تھی جیسے وہ آج بھارت میں مجبور ہے"۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور، مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۷۶ء، مضمون: "ہم نے پاکستان کی قدر نہ کی"، جناب زیڈ اے سلیری)

یہ طویل اقتباس ہم نے اس لیے نقل کیا ہے کہ پاکستان اور اس کے بانی کے ساتھ ہم نے جو تغافل برتا ہے اور قومی سطح پر اس سے ہمیں جو نقصان اُٹھانا پڑا۔ تحریک پاکستان کے ایک کارکن اور قائد کے رفیق کار کے قلم سے اس کا مختصر جائزہ آپ ملاحظہ فرمالیں۔ اس اقتباس سے ہمارے لیے غور و فکر اور تلافی مافات کی بہت سی راہیں کھل سکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

الصلوٰۃ والسلام علیک یا سیدی یا رسول اللہ ﷺ

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام



عرس مبارک

سالانہ

19واں

18 نومبر 2018ء

بروز اتوار بعد نماز عصر

ربیع الاول 1440ھ

حکیمِ اہلسنت حضرت

حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

چشتی نظامی قادری

بمقام

دربار حضرت میاں میر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لاہور

اس بابرکت محفل میں
شرکت فرما کر سعادتِ دارین
حاصل کریں

الداعی الی الخیر

دارالفیض گنج بخش 55- حکیم محمد موسیٰ امرتسری روڈ (ریلوے روڈ گوالمنڈی) حضرتِ لاہور 0333-4700611, 0321-4148064